بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

سورة البقرة (الآية 208)

فکرِ اسلامی: آگاہی و لائحۂ عمل

مرتب: سید اعجاز احمد

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے

وہی فطرت اسد اللہیؓ، وہی مرحبی، وہی عنتری



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

الحمد لله ربِّ العالمين، نحمده ونستعينہ ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، والصلاة والسلام علیٰ سيدنا محمدٍ خاتم النبيين، وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعين۔

قال تعالى:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ۖ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ

[الشورى: 13]

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ اہم مجموعۂ مضامین **"فکر اسلامی اگاہی ولائحہ عمل"** کے عنوان سے اہلِ علم، داعیانِ دین، اور بالخصوص تحریکی نو نسل کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ عصرِ حاضر میں جہاں فکری انتشار، اعتقادی کمزوری، الحاد، مادّیت، اور مختلف جدید نظریات و فکری تحریکات انسانی فکر و شعور کو متاثر کر رہی ہیں، وہاں اسلام کی حقیقی فکر، اس کی بنیادوں، اور اس کے جامع نظامِ حیات کو سمجھنا وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکا ہے۔

یہ مجموعہ مختلف اکابرینِ تحریکِ اسلامی، اہلِ علم، مفکرین، اور محققین کے خطبات، مضامین، مکالمات، اور تحریروں سے ماخوذ و مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ قاری کو ایک منظم، جامع، اور آسان انداز میں ان بنیادی فکری موضوعات سے روشناس کرایا جائے جو آج امتِ مسلمہ کو درپیش چیلنجز کو سمجھنے اور ان کا صحیح اسلامی فکر پر مبنی حل تلاش کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

اس کتاب میں سب سے پہلے اسلام کیا ہے؟ اس کے معنیٰ، مفہوم، اور ابتداء کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اسلام محض چند عبادات یا رسوم و روایات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دینِ حق ہے۔ اسی ضمن میں *دینِ حق* کی وضاحت، "الدین" اور "الاسلام" کے صحیح مفاہیم، اور ان کے متعلق پائے جانے والے عام مغالطوں کو قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

۔ ساتھ ہی یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کوئی نیا نظریہ یا نئی دعوت نہیں، بلکہ وہی ابدی دعوت ہے جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام لے کر آئے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی رہی، یعنی انسان کو بندگیِ رب، توحید اور اطاعتِ الٰہی کی طرف بلانا۔

اس تصنیف میں *فکرِ اسلامی* کی حقیقت، اس کی بنیادوں، اور انسانی زندگی میں اس کے عملی تقاضوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اسلام اور جاہلیت کے فرق، جاہلیت کی مختلف صورتوں، اور اسلام کی حقانیت کو دلائل و شواہد کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، تاکہ قاری موجودہ فکری کشمکش کو صحیح تناظر میں سمجھ سکے۔

اس کتاب میں جاہلیتِ قدیم و جدید، الحاد، اور مختلف فکری و تہذیبی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جدید دور میں سیکولرازم، لبرل ازم، نیشنلزم، مادّیت، دہریت، جدیدیت، اور دیگر "ازمز" نے مسلم معاشروں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کتاب میں ان (Postmodernism) ، مابعد جدیدیت (Modernism) نظریات کی بنیادوں، ان کے فکری پس منظر، اور امتِ مسلمہ پر ان کے اثرات کو قرآن و حدیث اور اکابر اہلِ علم کی تحقیقات کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مزید برآں، جاہلیت کی اصل روح، اس کی جڑیں، اور اس کے مختلف مظاہر کو بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ جاہلیت صرف ایک تاریخی دور کا نام نہیں بلکہ ہر وہ فکر، نظام، اور طرزِ زندگی جاہلیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے روگردانی اختیار کرے۔ اسی تناظر میں الحادِ جدید کے شبہات، فکری فتنے، اور نوجوان نسل کو درپیش اعتقادی چیلنجز پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

اس مجموعے میں خاص طور پر *امتِ مسلمہ کے مقصدِ وجود، اقامتِ دین کی حقیقت، اس کی فرضیت، اس کی ضرورت و اہمیت، اور امتِ مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ تصورِ اقامتِ دین پر کیے جانے والے اعتراضات، شبہات، اور فکری اشکالات کا علمی و متوازن جائزہ پیش کرتے ہوئے ایک واضح لائحۂ عمل بھی پیش کیا گیا ہے، تاکہ قاری نہ صرف اسلام کے جامع تصور کو سمجھے بلکہ اپنی فکری سمت بھی درست کرسکے۔

اسی کے ساتھ اس کتاب میں *جماعتِ اسلامی* کی خصوصیات، تحریکِ اسلامی کے طریقۂ کار، دعوتی و تربیتی اصولوں، اور اجتماعی جدوجہد کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ دین کے غلبے اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت کو بہتر انداز میں سمجھا جاسکے۔

یہ مواد بالخصوص IMA Kuwait HRD Members and team

کی علمی و تربیتی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تیار کیا جارہا ہے، تاکہ کارکنان، ممبرانان، اور دعوتی میدان سے وابستہ افراد کے لیے جامع اور قابلِ استفادہ فکری رہنمائی فراہم کی جاسکے۔ امید ہے کہ یہ کاوش فکری بیداری، دینی شعور، اور دعوتی تربیت میں معاون ثابت ہوگی۔

اس حصے میں بنیادی فکری، اعتقادی، اور اقامت دین کے موضوعات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ اس سلسلے کا پہلا حصہ ہے۔

PART-1

.:جن میں بالخصوص درج ذیل نکات شامل ہیں

.1. اسلام کیا ہے؟ — معنی، مفہوم، اور ابتداء کا تفصیلی جائزہ .

.2. دینِ حق کی وضاحت، "الدین" اور "الاسلام" سے متعلق عام مغالطوں کا ازالہ

.3 . اسلامی نظریۂ کی بنیادیں اور فرد و معاشرہ پر اس کے اثرات

.4 .اسلام اور جاہلیت کی وضاحت اور اسلام کی حقانیت

5. مختلف "ازمز"، جدیدیت، مابعد جدیدیت، اور عصرِ حاضر کے فکری چیلنجز

.6 .فکرِ اسلامی کی حقیقت اور اس کی بنیادی اساسات

.7 .اقامتِ دین کی فرضیت اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں

.8. جماعتِ اسلامی کی خصوصیات اور تحریکِ اسلامی کا طریقۂ کار

.9. تصورِ اقامتِ دین پر اعتراضات کا جائزہ اور عملی لائحۂ عمل

ان شاء اللہ آئندہ حصوں میں تحریکِ اسلامی کی تاریخ، اکابرینِ تحریک کے افکار، دعوتی و فکری سفر، تحریکِ اسلامی، اور امتِ مسلمہ کو درپیش معاصر مسائل پر مزید تفصیلی مواد پیش کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس معمولی کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اسے خالصتاً اپنی رضا کے لیے بنائے، اور اسے امتِ مسلمہ کے لیے نافع، مؤثر، اور ذریعۂ ہدایت بنائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق سمجھ کر اس پر عمل کرنے، اور باطل کو باطل سمجھ کر اس سے اجتناب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

وما علینا إلا البلاغ

واللہ ولی التوفیق۔

سید اعجاز احمد

Index

فکرِ اسلامی: آگاہی و لائحۂ عمل

فہرستِ مضامین

8 انسانی ذرائعِ علم کا جائزہ ۔

عقل *

سائنس *

تاریخ *

خواہشات *

9 انسانی فکر کی محدودیت ۔

10 قرآن کے دلائل ۔

11 الٰہی ہدایت: ذریعۂ نجات

باب سوم: اسلامی نظریۂ

(Islamic Ideology) اسلامی نظریہ کیا ہے؟

اسلامی نظریات کی بنیادیں ۔

فرد اور معاشرہ ۔

اسلامی معاشرت کا تصور ۔

باب چہارم: اسلام اور جاہلیت

جاہلیت کا مفہوم ۔

خالص جاہلیت ۔

رہبانیت ۔

شرک کی حقیقت ۔

باب پنجم: اسلام اور جدیدیت

باب ششم: فکرِ اسلامی

باب ہفتم: اقامتِ دین

باب ہشتم: جماعتِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی

جماعتِ اسلامی کی خصوصیات ۔

تحریکِ اسلامی کا تعارف ۔

تحریکِ اسلامی کا طریقِ کار ۔

دعوت اور تنظیم ۔

اسلامی انقلاب کی جدوجہد ۔

باب نہم: اقامتِ دین پر اعتراضات اور لائحۂ عمل

اقامتِ دین کا تصور ۔

اہم اعتراضات اور شبہات ۔

علمی و فکری جوابات ۔

عملی لائحۂ عمل ۔

موجودہ دور میں اسلامی جدوجہد ۔

باب اول:

اسلام کا بنیادی مفہوم

(1) اسلام کا لغوی و بنیادی مفہوم

(2) تشریحی اسلام اور اصطلاحی اسلام

(3) اسلام اور انسانیت

(4) ہر قوم کا دین اسلام تھا

(5) کیا اسلام صرف آخری دین کا نام ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معنی و مفہوم

اِسلام کا بنیادی مفہوم

لُغت کی رو سے "اسلام" کے معنی فرماں برداری کے ہوتے ہیں۔ لیکن گفتگو جب دین کی زبان میں ہو رہی ہو تو اس وقت اس لفظ کے معنی اس فرماں برداری کے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، اور 'مسلم' وہ ہوتا ہے جو احکامِ الٰہی کے مطابق چلے اور ان سے سرتابی نہ کرے۔

تکوینی اسلام

"احکامِ الٰہی" کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، تکوینی[1] اور تشریعی[2]:-

"تکوینی احکام" ان حکموں کو کہتے ہیں جن کے مطابق عمل چار و ناچار کرنا ہی پڑتا ہے، اور جن کی خلاف ورزی ناممکن ہوتی ہے۔ کیوں کہ مخلوق ان کی پابندی کرنے پر مجبور پیدا ہی کی گئی ہے، اور اسے پیدائشی طور پر اس بات کی آزادی بالکل نہیں دی گئی ہے کہ چاہے تو ان پر عمل کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مثال کے طور پر سُورج کو اس کے اور اس پوری کائنات کے مالک کا حکم ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت پر نکلے اور پھر ایک مقررہ وقت پر ڈوب جائے، زمین سے ایک مقررہ فاصلے پر رہے اور اسے روشنی اور گرمی پہنچائے۔ سُورج ان احکام پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اسے یہ طاقت حاصل

نہیں کہ ان کی تعمیل سے کبھی انکار کر جائے۔ اسی طرح ہوا کو اس بات کا حکم ہے کہ وہ جان داروں کو زندہ رکھے، پانی کو حکم ہے کہ پیاس بجھائے، آگ کو حکم ہے کہ جلائے، اور انسان کو حکم ہے کہ وہ زبان سے بولے، کان سے سُنے، ناک سے سونگھے۔ اور یہ سب کے سب اس بات پر مجبور ہیں کہ ان حکموں کی پابندی کریں۔ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا اُن کے بس ہی میں نہیں ہے۔ اس طرح کے احکام کو 'قوانین طبعی'، اور 'قوانینِ قدرت' بھی کہتے ہیں اور عام طور سے یہی نام زیادہ مشہور ہیں۔

"تشریعی احکام" اللہ تعالیٰ کے ان حکموں کو کہتے ہیں جن کی پیروی پیدائشی مجبوری کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ آزاد مرضی کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخلوق کو ان پر عمل کرنے کا بھی اختیار حاصل ہوتا ہے اور عمل نہ کرنے کا بھی۔ مثلاً انسان کو حکم ہے کہ وہ ایک خدا کی بندگی کرے۔ لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے پیدائشی طور پر مجبور نہیں ہے، بلکہ اسے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اسی ایک خدا کی بندگی کرے، چاہے تو اس کے ساتھ ہزاروں کو خدا بنالے، اور چاہے تو سرے سے خدا اور خدائی ہی سے انکار کر بیٹھے۔ ان احکام کو 'شرعی احکام' یا 'شرعی قوانین' بھی کہتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے احکام یکساں طور پر اللہ ہی کے احکام ہیں۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کا نام اسلام ہے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کی اطاعت معنیً 'اسلام' ہی ہوگی۔ یہ ایک صاف اور کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

پھر چوں کہ جمادات سے لے کر انسانوں اور فرشتوں تک کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے خالق کی محکوم نہ ہو، اور جسے تکوینی یا تشریعی، کسی قسم کے احکام نہ دیے گئے ہوں۔ اس لیے 'اسلام' اور 'مسلم' ہونے کا مسئلہ صرف انسان ہی تک محدود نہیں رہ جاتا، بلکہ پوری کائنات تک وسیع ہو جاتا ہے، اور اسلام کسی ایک مخلوق کا نہیں، بلکہ ساری مخلوقات کا دین قرار پا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان مخلوقات کا دین بھی "اسلام" ہی ہے جنھیں ارادہ و اختیار کی آزادی سے محروم پیدا کیا گیا ہے اور جن کو صرف تکوینی احکام دیے گئے ہیں۔ اسی طرح چوں کہ وہ اپنے ان احکام کی پوری پوری پابندی

لازماً کرتی ہی ہیں اس لیے وہ سب کی سب 'مسلم' اور کامل 'مسلم' ہیں ـــــ یہ سورج 'مسلم' ہے، کیوں کہ وہ اسی ایک مقررہ نظام کے مطابق گردش کرتا ہے، نکلتا اور ڈوبتا ہے، گرمی پہنچاتا اور روشنی پھیلاتا ہے، جو اس کے لیے بنا دیا گیا ہے۔ یہ چاند اور تارے 'مسلم' ہیں، کیوں کہ وہ جن ضابطوں کے پابند ٹھیرائے گئے ہیں انہیں کبھی نہیں توڑتے۔ یہ ہوا 'مسلم' ہے، کیوں کہ وہ اسی طرح چلتی، اسی طرح بادلوں کو ہنکاتی، اسی طرح نباتات کو غذا دیتی اور تازگی بخشتی اور اسی طرح جان داروں کو زندہ رکھتی ہے جس طرح اسے حکم دیا گیا ہے۔ یہ پانی 'مسلم' ہے کیوں کہ وہ زمینوں کو سیراب کرتا ہے، پودوں کو اگاتا ہے، پیاس بجھاتا ہے اور حرارت پاکر بھاپ بن جاتا ہے، اور یہی کچھ اس کے خالق و مالک کی طرف سے اس کی ڈیوٹی مقرر کی گئی ہے۔

یہ بات کہ بے ارادہ اور بے اختیار مخلوقات کا دین بھی "اسلام" ہی ہے اور وہ سب کی سب "مسلم" ہیں، صرف عقل اور قیاس کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے، بلکہ اس کی اصل بنیاد قرآن حکیم کی کھلی تصریحات پر ہے۔ چناں چہ وہ کہتا ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ[1] الخ

کیا یہ (منکرین حق) اللہ کے دین کے بجائے کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ وہ تمام کے تمام اسی کے "مسلم" (فرماں بردار) ہیں جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں۔ الخ

یہ الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آسمانوں سے لے کر زمین تک کی ہر مخلوق ـــــ دینِ حق کے منکر انسانوں اور جنوں کے سوا ـــــ اللہ کی "مسلم" ہے اور ان سب کا دین "اسلام" ہی ہے۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو جو اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں بیان کر رہی ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ[2]

---

[1] سورہ آل عمران - ۸۳ [2] سورہ اسراء - ۴۴

ساتوں آسمان اور زمین، اور وہ جو ان میں ہیں سب کے سب اللہ کی پاکی اور برتری بیان کر رہے ہیں، اس کائنات کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، مگر تم ان کی تسبیحوں کو سمجھتے نہیں۔

ایک تیسری آیت اور سُنیے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ[1]

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ فی الواقع اللہ کو سبھی سجدہ کر رہے ہیں، وہ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں، اور سورج، اور چاند اور تارے، اور پہاڑ، اور درخت اور چوپائے، اور بہت سے انسان۔

معلوم ہوا کہ کوئی ایک دو مخلوقات نہیں، بلکہ یہ آسمان و زمین، یہ چاند اور سورج، یہ تارے اور سیّارے، یہ ہوا اور پانی، یہ درخت اور پودے، یہ دریا اور پہاڑ، یہ چرند اور پرند، یہ انسان اور جن، غرض ذرّے سے لے کر آفتاب تک ہر چھوٹی بڑی، جان دار، بے جان، ذی عقل اور بے عقل مخلوق اللہ رب العزّت کی "حمد" اور "تسبیح" کر رہی ہے اور اسی کے آگے سربسجود ہے۔ اس "حمد"، اور "تسبیح" کا، اور اس "سجدے" کا کم سے کم اتنا مفہوم تو واضح ہی ہے کہ یہ مخلوقات ان احکام اور قوانین کی بال بال پابندی کرتی رہتی ہیں جو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما رکھے ہیں، اور اس طرح کی ذات اور صفات پر زبانِ حال سے گواہی دیتی رہتی ہیں۔

ان آیتوں نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ ساری بے ارادہ اور بے اختیار مخلوقات

---

[1] سورہ حج ـ ۱۸

کا دین بھی اسلام ہی ہے۔ لیکن انھیں جو احکام دیے گئے ہیں وہ چوں کہ صرف تکوینی قسم کے ہیں اس لیے ان کے اسلام کی نوعیت بھی 'تکوینی یا پیدائشی' اسلام کی ہوگی، اور ان کو 'تکوینی یا پیدائشی' مسلم کہا جائے گا۔

تشریعی اور اصطلاحی اسلام

اب ان مخلوقات کو لیجیے۔ جو ارادہ و اختیار کی آزادی رکھتی ہیں۔ ان کی فطری پوزیشن یہ ہے کہ اگر بہت سی باتوں میں وہ بھی پہلی قسم کی مخلوقات ہی کی طرح مجبور اور بے اختیار ہیں تو بہت سے معاملات میں اس طرح مجبور و بے اختیار نہیں بھی ہیں، بلکہ پیدائشی طور پر انہیں اس بات کی آزادی ملی ہوئی ہے کہ ان معاملات میں جو رویّہ بھی چاہیں اختیار کریں۔ مثلاً انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے بعض قوانین یہ ہیں کہ وہ آنکھ سے دیکھنے کا، کان سے سُننے کا اور زبان سے بولنے کا کام لے، اور کچھ دُوسرے قوانین یہ ہیں کہ وہ آنکھ سے فلاں چیز دیکھے اور فلاں چیز نہ دیکھے، کان سے اس طرح کی باتیں سُنے، اس طرح کی نہ سُنے، اس کی زبان سے ایسی باتیں نکلیں، ایسی نہ نکلیں۔ پہلی قسم کے قوانین کی پیروی تو وہ لازماً کرتا ہے۔ کیوں کہ ان امور میں اسے بات ماننے یا نہ ماننے کی کوئی آزادی دی ہی نہیں گئی ہے، اس لیے وہ مجبور ہے کہ انہی قوانین کے مطابق عمل کرے لیکن دوسری قسم کے قوانین کے بارے میں اسے اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو ان پر عمل کرتا ہے، چاہتا ہے تو نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں اُسے فرماں برداری اور نافرمانی، دونوں کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ اس لیے جس طرح پہلی قسم کے احکام کی حد تک، اور زندگی کے غیر اختیاری دائرے میں، افرادِ انسانی کا 'اسلام' بھی 'تکوینی اور پیدائشی اسلام ہی کہا جائے گا، اسی طرح زندگی کے باقی، یعنی با اختیار دائرے میں، ان کے اسلام کو تشریعی اور اختیاری اسلام، کہنا چاہیے۔ لیکن دینی اصطلاح میں "تشریعی احکام" کے لیے تشریعی احکام، یا تشریعی و اختیاری اسلام کے لیے تشریعی و اختیاری اسلام کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے

ہیں، بلکہ 'تشریعی' اور 'اختیاری' کی قید کے بغیر صرف "احکامِ الٰہی" اور "اسلام" کے الفاظ کے استعمال کو کافی سمجھا گیا ہے۔ وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے۔ جو مخلوقات تکوینی احکام کے ساتھ ساتھ تشریعی احکام کی بھی مکلّف ہیں، ان کی حد تک اطاعت اور نتیجۂ اطاعت کے اعتبار سے تکوینی احکام کی کوئی اہمیت باقی ہی نہیں رہ جاتی، اور تشریعی احکام ہی سب کچھ بن جاتے ہیں۔ اس لیے عام گفتگو میں "احکامِ الٰہی" کا اور "اسلام" کا لفظ بجا طور پر صرف ان 'تشریعی احکام' ہی کے لیے مخصوص ہو کر رہ جانا چاہیے تھا اور یہی کیا گیا ہے۔

پھر اسی بات کا تقاضا یہ بھی ہوا کہ جو لوگ تشریعی احکام کو نہ مانیں اُن کے لیے "مسلم" کا لفظ بالکل ہی نہ استعمال کیا جائے۔ حالاں کہ وہ اس حالت میں بھی تکوینی احکام کی پوری پوری پابندی کر رہے ہوتے ہیں، اور اس بنا پر ان کی حد تک تو وہ لازماً "مسلم" ہی ہوتے ہیں۔ لیکن چوں کہ اختیاری اسلام کے نہ ہونے کی صورت میں جبری اسلام کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ اس لیے اس کا کوئی لحاظ بھی نہیں کیا جاتا، اور شریعت کی اصطلاح میں کسی شخص کو "مسلم" صرف اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ تکوینی احکام کی جبری پابندی سے آگے بڑھ کر تشریعی احکام کے آگے بھی رضا کارانہ جھک چکا ہو۔

اِسلام اور انسان

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا، جن مخلوقات کو ارادے اور اختیار کی آزادی عطا کی گئی ہے، انسان بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ انہی میں سے ایک ہے، بلکہ اس معاملے میں وہ ایک خاص امتیاز بھی رکھتا ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اسے تشریعی احکام بھی دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ جس وقت پہلا انسان اس دنیا میں بسنے کے لیے بھیجا جا رہا تھا اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا تھا کہ:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۔[1]

پس اگر میری جناب سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کوئی اندیشے کی بات نہ ہو گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ انکار کے راستے پر چلیں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخی ہوں گے۔

اس اعلان میں "ہدایت"، یعنی احکامِ شریعت بھیجنے کی بات بظاہر "اگر" کی شرط کے ساتھ کہی گئی تھی، مگر حقیقت میں یہ شرط نہیں ہے، بلکہ کلام کا ایک شاہانہ انداز ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس میرے احکام ضرور جائیں گے، جن کی اطاعت کرنا تمہارا فرض ہو گا۔

چناں چہ عملاً جو کچھ ہوا اس کی وضاحت قرآن مجید کے اس ارشاد سے ہوتی ہے :۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ ۔[2]

کوئی امّت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو۔

یہ دونوں آیتیں اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ اس زمین پر انسان کی آبادی اور تشریعی احکام کی آمد، دونوں ایک ساتھ شروع ہوئی ہیں، اور اس وقت سے آج تک یہ انسانی دنیا دین و شریعت سے کبھی خالی نہیں رہی ہے، اور کوئی اُمّت نہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محروم اور بے خبر رکھی گئی ہو، جیسا کہ انسان کے ایک بااختیار مخلوق ہونے کا تقاضا تھا۔

ہر قوم کا دین اسلام تھا

چوں کہ تشریعی احکام کے وہ سارے مجموعے، جو پہلے دن سے آج تک آئے ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے تھے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کی پیروی

---

[1] سورہ بقرہ ۔ ۳۹ [2] سورہ فاطر ۔ ۲۴

اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت تھی، اور اس بنا پر ان میں کا ہر مجموعۂ احکام یعنی ہر ایک دین، دراصل "اسلام" ہی تھا، اور ان کے ماننے والے سب کے سب حقیقتاً "مسلم" ہی تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر عقل کا فیصلہ اور قرآن مجید کی شہادت دونوں متفق ہیں۔
حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :۔

مَا کَانَ اِبْرَاھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّ لٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ۔[1]

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ ایسا مسلم تھا جو ہر طرف سے کٹ کر اللہ ہی کے لیے یکسو ہو چکا تھا۔

ایک اور جگہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد —— حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف علیہم السلام وغیرہ —— سب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ :۔

اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَوَصّٰی بِھَآ اِبْرَاھِیْمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ .... قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰھَکَ .... وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ۔[2]

یاد کرو اس وقت کو جب کہ ابراہیم سے اس کے رب نے کہا تھا کہ مسلم (یعنی تابع فرمان) بن جا، تو اس نے جواب دیا تھا کہ میں سارے جہانوں کے آقا کا مسلم (تابع فرمان) بن گیا۔ پھر اسی امر کی وصیّت کی تھی ابراہیم نے اپنی اولاد کو، اور یعقوب نے اپنی اولاد کو، کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہ دین منتخب کیا ہے، سو دیکھنا آخری سانس تک مسلم (اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان)

---

[1] سورہ آل عمران ــ ۶۷ [2] سورہ بقرہ ــ ۱۳۱ تا ۱۳۳ ۔

رہنا.... انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود کی ..... اور ہم اسی کے مسلم (تابعِ فرمان) ہیں۔

قرآن مجید میں اسی طرح کی صراحتیں حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ انبیاء کے بارے میں بھی کی گئی ہیں، اور صاف طور سے کہا گیا ہے کہ وہ اور ان کے پیرو، سب کے سب "مسلم" تھے، اور سب کا دین "اسلام" ہی تھا۔

"اسلام" نام صرف آخری دین کا ہے

اس حقیقت کی موجودگی میں، جو ابھی بیان ہوئی کسی بھی آسمانی دین کو دوسرے دینوں کے مقابلے میں بظاہر نام اور تعبیر کا کوئی امتیاز حاصل نہ ہونا چاہیے، اور چاہے قرآنی شریعت ہو چاہے توراتی، حضرت آدمؑ کا لایا ہوا دین ہو یا حضرت نوحؑ کا، حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہونے والی ہدایت ہو یا حضرت عیسیٰؑ پر ـــــ نام بھی سب کا یکساں طور پر "اسلام"، اور ان کے پیرووں کا "مسلم"، ہی ہونا چاہیے، جس طرح کہ اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے یہ ساری شریعتیں یکساں طور پر "اسلام" ہی تھیں اور ان سب کے پیرو "مسلم"، ہی تھے۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس سے مختلف ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی خاص اصطلاح میں "اسلام"، نام صرف اسی ایک دین کا ہے جسے وہ خود پیش کرتا ہے اور جس کو آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا گیا تھا۔ اسی طرح "مسلم"، کا نام بھی صرف انھی لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اسی آخری دین کے ماننے والے ہیں۔ چناں چہ وہ جب "الاسلام" کا لفظ بولتا ہے تو اس وقت اس کی مراد اسلام کے عام مفہوم سے نہیں ہوتی، بلکہ خاص اسی ایک دین اور مجموعۂ احکامِ الٰہی سے ہوتی ہے۔ مثلاً:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔[1]

---

[1] سورہ مائدہ ـ ۳

مسلمانو! آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے بحیثیت دین کے "الاسلام" کو پسند کیا ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔[1]

بلاشبہ اللہ کے نزدیک (پسندیدہ اور مقبول) دین "الاسلام" ہے۔

اِن آیتوں میں "الاسلام" صاف طور پر خاص اسی ایک دین کو کہا گیا ہے جو قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے۔

جہاں تک "مسلم" نام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد سُنیے:۔

ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا۔[2]

.... اسی نے تمہارا نام پہلے ہی سے اور اسی امر کے پیشِ نظر "مسلم" رکھا ہے۔

یہ الفاظ اپنے مدعا میں بالکل صاف اور صریح ہیں۔ یہ فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ معنوی حیثیت سے اور صفاتی طور پر، اگرچہ وہ تمام لوگ بھی مسلم ہی تھے جو پچھلے زمانوں میں کسی نبی پر ایمان لائے تھے، لیکن یہ شانِ امتیاز صرف اسی آخری دین کے ماننے والوں کو حاصل ہے کہ معنوی حیثیت سے مسلم ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری نام و لقب بھی ان کا "مسلم" ہی ہے، ان کے سوا اہلِ ایمان کا اور کوئی گروہ نہیں جس کا نام بھی مسلم رکھا گیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا کہ دوسروں کا نام بھی مسلم ہوتا تو یہ کہے جانے کا کوئی محل نہ ہوتا کہ 'اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے'؛ کیوں کہ جب اہلِ ایمان کے دوسرے تمام گروہ بھی نام کے اعتبار سے مسلم ہی تھے تو کسی ایک گروہ کے متعلق اس صراحت کا کیا جانا تحصیلِ حاصل ہوتا کہ اس کا نام مسلم رکھا گیا ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں جب بھی کسی اور اُمّت یا گروہ کو مسلم کہتے سُنا جائے گا (جیسا کہ اکثر کہا گیا ہے) تو یہ دراصل اس کی معنوی حیثیت کا اظہار ہوگا، یا یوں کہیے کہ اس کا صفاتی نام ہوگا، اصطلاحی نام و لقب نہ ہوگا۔

---

[1] سورہ آل عمران ـ ۱۹

[2] سورہ حج ـ ۷۸

اِمتیاز کی وجہ

سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ امتیاز کیوں ہے؟ جب دوسرے انبیاء کے لائے ہوئے دین بھی اُسی طرح اللہ ہی کے بھیجے ہوئے تھے جس طرح کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے، اور اُن کے پیرو بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مسلم (تابع فرمان) تھے جس طرح کہ اس دین کے پیرو ہیں تو اسلام نام صرف اسی ایک دین کا، اور مسلم نام صرف اسی ایک دین کے پیرووں کا کیوں ہوا؟ اگر حقیقتاً سارے دین "اسلام" ہی تھے، اور دوسرے تمام انبیاء کے ماننے والے بھی "مسلم" ہی تھے تو ان سب کا نام و لقب بھی "اسلام" اور "مسلم" کیوں نہ قرار پایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نام رکھے جانے کے ایک معروف اور اہم اصول کی بنا پر ایسا ہوا ہے، بلاوجہ نہیں ہوا ہے۔ اصول یہ ہے کہ ایک صفت اگر بہت سے افراد میں پائی جاتی ہو تو اس بات کا مستحق، کہ وہ صفت اس کا نام اور لقب بھی بن جائے صرف وہی فرد ہوتا ہے جس کے اندر وہ صفت دوسرے ہر فرد کے مقابلے میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کیوں کہ کسی صفت کا کسی شخص کا نام پڑجانا دراصل اس دعوے کا اظہار ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر یہ صفت حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے، اور دوسروں میں بھی اگرچہ پائی جاتی ہے لیکن اس درجے تک نہیں پائی جاتی، اور اس بارے میں وہ اس سے اتنے پیچھے ہیں کہ اس آفتاب کے سامنے ان تاروں کی روشنی گویا باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ مثال کے طور پر 'صدّیقیت' ایک صفت ہے، جو کتنے ہی بندگانِ خدا کو عطا ہو چکی ہے۔ مگر 'صدیق' کا لفظ بطور لقب کے صرف حضرت ابوبکرؓ کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا یہ مطلب تو کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ صدّیقیت کے مقام پر صرف آپؓ ہی فائز تھے، اور دوسرے تمام صحابہؓ اس سے محروم تھے۔ جب کہ ان حضرات میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو وہ نبی ہوتے۔ اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس مقدس گروہ میں ایک دو نہیں بے شمار صدیق تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ "صدیق" کے لقب سے سرفراز ہونے کا شرف صرف حضرت ابوبکرؓ کے حصے میں آیا؟ ظاہر ہے، اس کی وجہ اس کے سوا

اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ وہ صدیقیت کی صفت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ جیساکہ تاریخ، سیرت اور حدیث کے صفحات گواہ ہیں۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین، اور دُوسرے انبیاء کے لائے ہوئے دینوں کے معاملے پر غور کیجیے۔ ماننا پڑے گا کہ اگرچہ سارے دین معنوی حیثیت سے اسلام ہی تھے، مگر وہ دین جو قرآن کی شکل میں، اور نبی آخرالزماں کے ذریعے آیا، وہی اس بات کا مستحق تھا کہ اس کا نام بھی 'اسلام' ہو۔ کیوں کہ اس کی "اسلامیت" دوسرے تمام دینوں کی "اسلامیت" سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اور وہ ان کے مقابلے میں قطعی طور پر ایک بلند تر حیثیت کا مالک ہے۔ دوسرے ہر دین کا حال یہ ہے کہ اس کے احکام کا مجموعہ بھی نسبتاً مختصر اور محدود تھا، اس کے خطاب کا دائرہ بھی محدود تھا اور اس کے نفاذ کی مدّت بھی محدود تھی، جب کہ اس دین کا مجموعۂ احکام بھی مفصّل اور ہمہ گیر ہے، اس کا دائرۂ خطاب بھی غیر محدود ہے، اور اس کے نفاذ کی مدت بھی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس کا مخاطب سارا جہان ہے۔ اس کا تشریعی مزاج (صحیح انسانی فطرت سے مکمل) ہم آہنگی رکھتا ہے، اس کی تعلیمات پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک مکمل اور بہترین نظامِ حیات پر مشتمل ہیں، اور آدم علیہ السلام کے وقت سے اللہ تعالیٰ کی جس ہدایت اور نعمت کا اُترنا شروع ہوا تھا، یہی دین اس کا نقطۂ کمال ہے۔ جب صورتِ واقعہ یہ تھی تو تسمیہ کے معروف طریقے کا تقاضا یہی تھا کہ "اسلام" صرف اسی سب سے آخری، سب سے عام و ہمہ گیر، اور سب سے کامل دین کا نام ہوتا۔

اسی طرح اور امّتوں کو چھوڑ کر صرف پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو "مسلم" کا نام و لقب اس لیے ملا کہ ان کی 'مسلمانہ' حیثیت دوسروں کے مقابلے میں بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسے دین کے علم بردار تھے جو اپنی جامعیت میں اور اپنے مقاصد کی وسعت اور بلندی میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ ان کے سر قیامت تک کے لیے یہ بھاری ذمّہ داری ڈالی گئی تھی کہ ایک ایک قوم تک اللہ کا پیغام پہنچائیں گے، ساری دنیا کے سامنے اسلام کی شہادت دیں گے اور اس زمین کے چپّہ چپّہ پر دینِ حق قائم کر چکنے سے پہلے اپنی کمر نہ کھولیں گے۔ جب کہ دوسری

کسی امت کے اوپر ایسی بڑی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی۔ اس لیے حق یہی تھا کہ وہی "خیر الامم" کہے جائیں اور "مسلم" کا نام انہی کے لیے مخصوص کیا جائے۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اگرچہ تکوینی اور جبری طور پر تو پوری کائنات ہی 'مسلم' ہے اور تشریعی طور پر بھی وہ سبھی لوگ 'مسلم' ہی تھے جو اللہ کے بھیجے ہوئے کسی دین کے پیرو تھے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جناب سے آنے والا ہر دین "اسلام" ہی تھا — لیکن 'اسلام' اور 'مسلم' کے الفاظ جب عرف اور نام کے طور پر بولے جاتے ہیں تو 'اسلام' سے مراد صرف وہ دین ہوتا ہے جسے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے، اور 'مسلم' سے مراد صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس دین کو سچے دل سے مان کر اس کی پیروی اختیار کریں۔

باب دوم:

دین حق اور انسان کی رہنمائی

(1) دین حق کا تصور

(2) ''الدین'' کا مفہوم

(3) ''الاسلام'' کا مفہوم

(4) قرآن کا بنیادی دعویٰ

(5) طرز زندگی کی تقسیم

(6) انسان کی حقیقی ضرورت

(7) کیا انسان خود نظام زندگی بنا سکتا ہے؟

(8) انسانی ذرائع علم کا جائزہ

* عقل
* سائنس
* تاریخ
* خواہشات

(9) انسانی فکر کی محدودیت

(10) قرآن کے دلائل

(11) الٰہی ہدایت: ذریعہ نجات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دینِ حق

(یہ خطبہ ۲۱ر مارچ ۱۹۴۳ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دیا گیا تھا)

قرآن جس دعوے کے ساتھ نوعِ انسانی کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے، وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے :

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

یہی ذرا سا فقرہ میری اس تقریر کا موضوع ہے۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں، بہت اختصار کے ساتھ میں پہلے اس کے معنیٰ کی تشریح کروں گا، جس سے واضح ہو جائے گا کہ اس فقرے میں دراصل کس چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ پھر اس سوال پر بحث کروں گا کہ یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے یا نہیں اور آخر میں یہ بیان کروں گا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس تسلیم کرنے کے مقتضیات کیا ہیں۔

عموماً اس فقرے کا جو سیدھا سادھا مفہوم بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ "سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے" اور "اسلام" کا جو تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے، جواب سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد ﷺ نے ڈالی تھی"۔ "بنا ڈالی تھی" کا لفظ میں قصداً اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں، بلکہ بکثرت مسلمان اور اچھے خاصے ذی علم مسلمان، بھی حضرت محمد ﷺ کو "بانیِ اسلام" کہتے اور لکھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتدا آنحضرت ﷺ ہی سے ہوئی ہے اور آپ ہی اس کے بانی ہیں۔ لہٰذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا

مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے، تو وہ یہ گمان کرکے سرسری طور پر اس سے گزر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برحق ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدعی ہے، اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برحق ہونے کا دعویٰ کردیا ہے۔ اور جب ایک مسلمان اسے پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرے میں برحق کہا گیا ہے، اسے وہ خود بھی برحق مانتا ہے۔ یا اگر غور وفکر کے لیے، اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ بالعموم یہ رخ اختیار کرلیتی ہے کہ عیسائیت، ہندومت، بودھ مت اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کرکے اس کی حقانیت ثابت کی جائے۔ لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے، جس پر ایک سنجیدہ طالب علم کو ٹھہر کر بہت غور کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ غور کرنا چاہیے جتنا اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعوے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ''الدین'' اور ''الاسلام'' کا مفہوم متعین کرلینا چاہیے۔

اَلدِّین کا مفہوم

عربی زبان میں لفظ ''دین'' کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنیٰ غلبہ اور اقتدار کے ہیں۔ دوسرے معنیٰ اطاعت اور غلامی کے ہیں، تیسرے معنیٰ جزا اور بدلے کے اور چوتھے معنیٰ طریق اور مسلک کے۔ یہاں یہ لفظ اسی چوتھے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ دین سے مراد وہ طریقِ زندگی یا طرزِ فکر وعمل ہے کہ جس کی پیروی کی جائے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں بلکہ الدین کہہ رہا ہے۔ اس کے معنیٰ میں وہی فرق واقع ہوجاتا ہے، جو انگریزی زبان میں This is a way کہنے کے بجائے This is the way کہنے سے واقع ہوجاتا ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے، بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریق زندگی یا طرزِ فکر وعمل ہے۔ پھر یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقِ زندگی سے اس کی مراد زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص شعبے کا طریق نہیں، بلکہ پوری زندگی کا طریق ہے۔ الگ الگ، ایک ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریق نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کا طریق بھی ہے۔ ایک خاص ملک یا ایک

خاص قوم یا ایک خاص زمانے کا طریق نہیں، بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریق ہے۔ لہٰذا قرآن کے دعوے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پوجا پاٹ اور عالمِ بالا کے اعتقاد اور حیاتِ بعد الممات کے تصور کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے، جس کا نام اِسلام ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افرادِ انسانی کے مذہبی طرزِ خیال وعمل کی (جیسا کہ لفظ "مذہبی" کا مفہوم آج کل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) ایک صحیح صورت وہی ہے، جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور، مثلاً صنعتی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لیے، ایک صحیح نظامِ زندگی وہی ہے، جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے، بلکہ صریح طور پر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ "ہر زمانے اور ہر دور میں پوری نوعِ انسانی کے لیے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی ڈھنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام اَلْاِسلام ہے۔"

مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی تفسیر کی گئی ہے جس کی رو سے دین کا مفہوم صرف بندے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدود ہے، اور تمدن اور سیاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔[1] یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہوگی، لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم "اَلدِّین" کے لفظ کو کسی محدود معنیٰ میں استعمال نہیں کرتا، بلکہ اس سے تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لئے ان کی پوری زندگی کا نظامِ فکر وعمل مراد لیتا ہے۔

الاسلام کا مفہوم

اب لفظ "اسلام" کو لیجیے۔ عربی زبان میں اس کے معنیٰ ہیں سپر ڈال دینا، جھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ مگر قرآن محض "اسلام" نہیں بولتا۔ بلکہ الاسلام بولتا ہے، جو اس کی خاص اصطلاح ہے۔ اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم واطاعت اور سپردگی وحوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانونِ طبیعت *Law of Nature* کے آگے سپر ڈال دی جائے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے

اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ نہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیل یا اپنے مشاہدات و تجربات سے خدا کی مرضی اور اس کے منشاء کا جو تصور بطور خود اخذ کر لے، اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعے سے انسان کے لیے جس طریق فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے، اس کو قبول کر لے اور اپنی آزادیٔ فکر و عمل یا بالفاظِ صحیح تر آوارگیٔ فکر و عمل چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر لے۔ اسی چیز کو قرآن ''الإسلام'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ درحقیقت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے، جس کی بنا اب سے تیرہ سو ترسٹھ برس پہلے عرب میں محمد ﷺ نے ڈالی ہو، بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا، اسی روز خدا نے انسان کو بتایا تھا کہ تیرے لیے صرف یہ ''الإسلام'' ہی صحیح طرزِ عمل ہے اور اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مامور ہوئے ہیں، ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی ''الإسلام'' ہی کی طرف رہی ہے، جس کی طرف بالآخر محمد ﷺ نے دنیا کو دعوت دی۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیرووں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے ایک نظام یہودیت کے نام سے اور مسیح علیہ السلام کے پیرووں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے اور اسی طرح ہندستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی امتوں نے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے ناموں سے بنا لیے ہوں۔ لیکن موسیٰ اور مسیح اور دوسرے تمام معروف و غیر معروف انبیاء علیہ السلام، جس دین کی دعوت دینے آئے تھے، وہ خالص اسلام تھا، نہ کہ کچھ اور۔

قرآن کا دعویٰ کیا ہے

اس تشریح کے بعد قرآن کا دعویٰ بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے:

> ''نوعِ انسان کے لیے خدا کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور فکر و عمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے''

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اب ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے۔ خود

قرآن نے اپنے اس دعوے کی تائید میں جو دلائل قائم کئے ہیں، ان پر ہم غور کریں گے ہی؛ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی جگہ تلاش و تجسس کر کے یہ دریافت کرلیں کہ ہمارے لیے اس دعوے کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی ہے۔

طریقِ زندگی کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہر حال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے، جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود متعین ہو جاتا ہے، انسان درخت نہیں ہے، جس کے لیے قوانین فطرت ایک راہ طے کر دیتے ہیں۔ انسان نرا جانور نہیں ہے، جس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں قوانین طبیعت کا محکوم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے، جن میں اسے کوئی لگا بندھا راستہ نہیں ملتا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فکر کی ایک راہ چاہیے، جس پر وہ اپنے اور کائنات کے ان بہت سے مسائل کو حل کرے، جنھیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش کرتی ہے، مگر ان کا کوئی حل غیر مشتبہ زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیے، جس پر وہ ان معلومات کو منظم کرے، جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعے سے اس کے ذہن تک پہنچاتی ہے۔ مگر انھیں بطور خود منظم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کو شخصی برتاؤ کے لیے ایک راہ چاہیے، جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے ان مطالبات کو پورا کرے، جن کے لیے فطرت تقاضا کرتی ہے، مگر انھیں پورا کرنے کا کوئی مہذب طریقہ معین کر کے نہیں دیتی۔ اس کو گھریلو زندگی کے لیے، خاندانی تعلقات کے لیے، معاشی معاملات کے لیے، ملکی انتظام کے لیے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لیے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لیے بھی، ایک راہ درکار ہے، جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نوع کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرتاً اس کے مطلوب و مقصود ہیں مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کر دیا ہے۔

زندگی کی تقسیم

زندگی کے یہ مختلف پہلو، جن میں کوئی ایک طریق اختیار کرنا انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ بجائے خود مستقل اور ایک دوسرے سے بے نیاز شعبے یا محکمے نہیں ہیں کہ ان میں ہر ایک کے لیے آدمی الگ الگ راہیں اختیار کرسکتا ہے، جن کی سمتیں الگ ہوں، جن کے زادِ راہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں، جن کی راہ نوردی کے مقتضیات الگ ہوں اور جن کے منازلِ مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذرا سی دانش مندانہ کوشش ہی آدمی کو اس پر مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے کہ زندگی بحیثیت مجموعی ایک ہے۔ جس کا ہر جز دوسرے جز سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے، گہرا ربط رکھتا ہے۔ ایسا ربط رکھتا ہے جو توڑا نہیں جاسکتا۔ ہر ایک دوسرے پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ ایک ہی خون سب رگوں میں گردش کرتا ہے۔ ایک ہی روح سب میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے اور سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں، جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فی الواقع جو چیز انسان کو درکار ہے، وہ زندگی کے مقاصد نہیں، بلکہ مقصد ہے، جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پوری موافقت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ لے سکیں اور جس کے حصول کی کوشش میں سب حاصل ہوجائیں، اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ درکار ہے، جس پر وہ اپنی پوری زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت، کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے مقصودِ حیات کی طرف لے چلے۔ اس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لیے الگ الگ نظامات نہیں، بلکہ ایک جامع نظام درکار ہے، جس میں یہ سب ہمواری کے ساتھ سموئے جا سکیں، جس میں ان سب کے لیے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں اور جس کی پیروی کرکے آدمی اور آدمیوں کا مجموعہ اور من حیث الکل پوری آدمیت، اپنے بلند ترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیت کا تاریک دور تھا، جب زندگی کو مستقل جداگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرزِ خیال کی مہمل گفتگو کرنے والے موجود ہیں، تو وہ بے چارے یا تو اخلاص کے ساتھ پرانے خیالات کی فضا میں اب تک سانس لے رہے ہیں، اس لیے قابلِ رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں، مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جس ''دین'' کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا

چاہتے ہیں۔ اس کے اصولوں سے اختلاف رکھنے والوں کو انھیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اس دین کے تحت تمھیں زندگی کے فلاں فلاں شعبوں میں، جو بدقسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پورا تحفظ حاصل رہے گا۔ حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرتاً ممتنع، عملاً ناممکن ہے۔ اس طرح کی گفتگو کرنے والے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔

ہر دین غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی روح اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ہی رہتا ہے۔ جس طرح ہر کانِ نمک ان تمام چیزوں کو مبدل بہ نمک کر کے ہی رہتی ہے، جو اس کے حدود میں داخل ہو جائیں۔

زندگی کی جغرافیائی و نسلی تقسیم

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو جداگانہ شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ اسے جغرافیائی حلقوں یا نسلی دائروں میں تقسیم کیا جائے۔ انسان بلاشبہ زمین کے حصوں میں پایا جاتا ہے، جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا ہے اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں، جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے اسباب سے انسانیت کے نشو و ارتقاء نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، لیکن اس اختلاف کو حجت قرار دے کر جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم اور ہر جغرافیائی آبادی کے لیے "دین" یعنی نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیے وہ سراسر ایک مہمل بات کہتا ہے۔ اس کی محدود نگاہ مظاہر اور عوارض کے اختلاف میں الجھ کر رہ گئی، اس ظاہری کثرت کے اندر جوہر انسانیت کی وحدت کو وہ نہیں پا سکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلاف اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر دین الگ الگ ہونے چاہییں، تو میں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپ پاتے ہیں ان سب کو جس قدر مبالغے کے ساتھ چاہیں قلم بند کر لیں اور پھر ان اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں، جو عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچوں میں پائے جاتے ہیں، شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ دعویٰ کروں کہ علمی تحلیل و تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے اختلافات بہر حال شدید تر ہی نکلیں گے۔ پھر کیوں نہ کہہ دیجیے کہ ہر فرد کا نظامِ زندگی الگ ہونا

چاہیے؟ مگر جب آپ انفرادی، جنسی، خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور پائدار عنصر ایسا پاتے ہیں جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصور قائم ہوسکتا ہے اور اس تصور کی بنا پر ایک قوم، یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لیے ایک نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے، تو آخر کس چیز نے آپ کو روک دیا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے درمیان ایک بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پاسکتے، جس پر انسانیت کا تصور قائم ہو اور جس کی بنا پر تمام عالمِ انسانی کا ایک دین یا نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جائے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافیائی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود وہ قوانینِ طبعی یکساں ہیں، جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، وہ نظامِ جسمانی یکساں ہے، جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، وہ خصوصیات یکساں ہیں، جن کی بناء پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے، وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں ہیں، جو انسان کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں۔ وہ قوتیں یکساں ہیں، جن کے مجموعے کو ہم نفسِ انسانی کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ تمام طبیعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی، معاشی عوامل بھی یکساں ہیں، جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے، تو جو اصول انسان بحیثیتِ انسان کی فلاح کے لیے صحیح ہوں، ان کو عالمگیر ہونا چاہیے، ان کے قومی یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان اصولوں کے تحت اپنی خصوصیات کا اظہار اور جزوی طور پر اپنے معاملاتِ زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کرسکتی ہیں اور ان کو ایسا کرنا چاہیے۔ مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے، جس صحیح دین یا نظامِ زندگی کی ضرورت ہے، وہ بہرحال ایک ہی ہونا چاہیے، عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لیے حق ہو، وہ دوسری قوم کے لیے باطل ہوجائے اور جو ایک قوم کے لیے باطل ہو، وہ دوسری قوم کے لیے حق ہوجائے۔

زندگی کی زمانی تقسیم

ان مہملات اور جدید زمانے کے عالمانہ مہملات میں سے ایک اور بات جو حقیقت کے اعتبار سے مہمل ترین ہے، مگر حیرت ہے کہ یقینیت کے پورے وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کی زمانی تقسیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو نظامِ زندگی ایک دور میں حق ہوتا ہے، وہ دوسرے دور میں باطل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دور میں بدل جاتے

ہیں۔اور نظامِ زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر ان مسائل و معاملات ہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ یہ بات اسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے، جس کے متعلق ہی ساتھ ہی ساتھ ارتقاء کی گفتگو بھی کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں کارفرما قوانین بھی تلاش کیے جاتے ہیں، جس کے گزشتہ تجربات سے حال کے لیے سبق اور مستقبل کے لیے احکام بھی مستنبط کیے جاتے ہیں، اور جس کے لیے ''انسانی فطرت'' نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آلہ پیمائش ہے، جس سے آپ نوعِ انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دور یا زمانے یا عہد کی حد بندیاں کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان حد بندیوں میں سے واقعی کسی ایک خط پر انگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اس پار جو مسائلِ زندگی تھے وہ اس پار آ کر بالکل تبدیل ہو گئے اور جو حالات اس پار تھے وہ اس پار باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگزشت ایسے ہی الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک ٹکڑا جو گزر چکا ہے وہ بعد والے ٹکڑے کے لیے محض ایک فضول ولایعنی چیز ہو گیا۔ اس کے گزرتے ہی وہ سب کچھ ضائع ہو گیا جو انسان نے اس حصۂ دہر میں کیا تھا۔ اس زمانے میں جو تجربات انسان کو ہوئے، وہ بعد والے زمانے کے لیے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے، کیونکہ وہ حالات و مسائل ہی فنا ہو گئے، جن میں انسان نے بعض طریقوں کا، بعض اصولوں کا، بعض قدروں کے لیے سعی و جہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقاء کی گفتگو کیوں؟ یہ قوانینِ حیات کی تلاش کس لیے؟ یہ تاریخی استنباط کس بناء پر؟ جب آپ ارتقاء کا نام لیتے ہیں، لامحالہ یہ اس بات کو متضمن ہے کہ وہاں کوئی چیز ضرور ہے، جو اتمام تغیرات کا موضوع بنتی ہے اور ان تغیرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے پیہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ قوانینِ حیات پر بحث کرتے ہیں، تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، ان رواں دواں مظاہر میں، ان بننے اور بگڑنے والی صورتوں میں کوئی ناپائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو ایک ذاتی فطرت اور کچھ مستقل قوانین بھی رکھتی ہے۔ جب آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اس طول طویل رستے پر جو مسافر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آ رہا ہے اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے، وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے۔ جس کے متعلق یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے۔ ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے

وقت میں انھیں رد کر دیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوعِ تغیرات، یہ شاہراہِ تاریخ کا مستقبل مسافر ہی تو ہے، جسے آپ غالباً ''انسانیت'' کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ راستے کی منزلوں اور ان میں پیش آنے والے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں، تو اس گفتگو میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ سچ ہے کہ منزلیں اور ان کے حالات اور ان کے مسائل بدل جانے سے مسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت بالکل نہیں بدلی، اس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جو اب سے ہزاروں برس پہلے تھے، اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات خصوصیات وہی ہیں، اس کے رجحانات ومیلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور قابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل وانفعال اور تاثیر وتأثر کے قاعدے وہی ہیں، اس پر کارفرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتدائے آفرینش سے آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ تاریخ کے دوران میں حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائلِ زندگی کے تغیر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آئی ہے، یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیر ہوتی رہی ہیں، جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہو سکتا ہے کہ انسان کے لیے جو چیز کل تریاق تھی، وہ آج زہر ہے، جو چیز کل حق تھی، وہ آج باطل ہے، جو چیز کل قدر رکھتی تھی وہ آج بے قدر ہے؟

انسان کس طرح کے طریقِ زندگی کا حاجت مند ہے

اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفسِ انسانیت کو اور اس سے تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں غلطی کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں مبالغہ اور بعض کے ادراک میں قصور کرکے جو غلط نظامِ زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کیے اور جنہیں انسانیتِ کبریٰ (Humanity of large) نے تجربے کے بعد غلط پا کر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا، ان کی سرگزشت کرکے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا گیا ہے کہ انسانیت کے لیے لازماً ہر دور میں ایک نظامِ زندگی درکار ہے۔ جو صرف اسی دور کے حالات و

مسائل سے پیدا ہو، اور ان ہی کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگزشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی و دوری نظاماتِ زندگی یا بالفاظِ دیگر موسمی حشرات الارض کو بار بار آزمانے اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشیں کا تجربہ کرنے میں، انسانیتِ کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس کی راہ ماری جاتی ہے، اس کے نشو و ارتقاء اور اپنے کمالِ مطلوب کی طرف اس کے سفر میں سخت رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ وہ درحقیقت محتاج اور سخت محتاج ہے، ایسے نظامِ زندگی کی جو خود اس کو اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے، جسے لے کر وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیریت گزر سکے۔ ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کر سکے۔ زندگی کے راستے پر افتاں وخیزاں نہیں، بلکہ رواں اور دواں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکے۔

کیا انسان ایسا نظام خود بنا سکتا ہے؟

یہ ہے اس ''دین'' یا طریقِ زندگی یا نظامِ زندگی کی نوعیت، جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے اس نوعیت کا دین بنانا چاہے، تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال میں آپ کے سامنے پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا جواب تو قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے اپنے دین پیش کر رہے ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے سے لڑمر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، جن کے لیے انسان، من حیث الانسان ایک ''الدین'' کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافیائی، کسی کا طبقاتی اور کسی کا دین پیدا ہی اس دور کے تقاضوں سے ہوا ہے، جو ابھی کل ہی گزر چکا ہے۔ رہا وہ دور جو کل آنے والا ہے، اس کے حالات و مسائل کے متعلق کچھ پیشگی نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں۔ کیونکہ جو دور اب گزر رہا ہے، ابھی تو اسی کے تاریخی تقاضوں کا جائزہ باقی ہے۔ اسی لیے میں یہ سوال نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس سے سرسری طور پر بحث کرنا مناسب نہیں، یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لیے

پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ وہ چیز کیا ہے، جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں، جس کے متعلق یہ پوچھا جارہا ہے کہ وہ اس کو وضع کرسکتا ہے یا نہیں۔

الدّین کی نوعیت

انسان کے لیے جس ''الدین'' کی ضرورت میں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے، جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے تمام چھوٹے بڑے جزئیات تک مرتب ہوں اور جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔ بلکہ دراصل اس سے مراد ایسے ہمہ گیر ازلی وابدی اصول ہیں، جو تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کرسکیں، اس کی فکر ونظر سعی وجہد اور پیش قدمی کے لیے صحیح رخ متعین کرسکیں اور اسے غلط تجربات میں وقت اور محنت اور قوت ضائع کرنے سے بچاسکیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم (قیاس وگمان نہیں بلکہ علم) ہو کہ اس کی اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر وہ اس بات کے جاننے کا (سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے کا) حاجت مند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے یا پوری زندگی کا ایک ابتدائی حصہ ہے، آیا سفر بس پیدائش سے لے کر موت تک کی مسافت کا ہے، یا یہ پورے سفر میں سے محض ایک مرحلہ ہے۔ پھر اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصدِ زندگی اس کے لیے متعین ہو جو حقیقت کے اعتبار سے (نہ کہ محض خواہش کی بنا پر) واقعی حیاتِ انسانی کا مقصود ہو، جس کے لیے دراصل انسان پیدا کیا گیا ہو اور جس کے ساتھ ہر فرد، ہر مجموعۂ افراد اور بحیثیتِ کلی تمام انسانیت کے مقاصد، تمام زمانوں میں، بلا کسی تصادم ومزاحمت کے ہم آہنگ ہوسکیں۔ پھر اس کو اخلاق کے ایسے پختہ اور ہمہ گیر اصولوں کی ضرورت ہے، جو اس کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہوں اور تمام ممکن حالات پر نظری وعملی حیثیت سے منطبق ہوسکتے ہوں۔ تاکہ وہ ان ہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کرسکیں، ان ہی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی کی ہر منزل اور اس کے حالات میں پیش آمدہ مسائل کو حاصل کرسکیں اور اس خطرے میں مبتلا نہ ہوں کہ تغیر پزیر حالات ومسائل کے ساتھ ساتھ اخلاق کے اصول بناتا اور بدلتا چلا جائے۔ یعنی بالفاظِ دیگر ایک بے اصولا، نرا ابن الوقت Mere characterless opportunist بن کر رہ جائے۔ پھر اس کو تمدن کے ایسے جامع اور وسیع اصولوں کی ضرورت ہے، جو انسانی اجتماع

کی حقیقت و غایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بنائے جائیں، جن میں افراط و تفریط اور بے اعتدالی نہ ہو، جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو اور جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل، اور ترقی کے لیے سعی کی جا سکے۔ پھر اسے شخصی کردار، اور اجتماعی رویہ اور انفرادی و اجتماعی سعی و عمل کو صحیح سمتِ سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے جامع حدود کی ضرورت ہے جو شاہراہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دیں اور ہر موڑ اور ہر دوراہے، ہر خطرناک مرحلے پر اسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ ادھر نہیں، بلکہ ادھر ہے۔ پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دائمی اور عالمگیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اس حقیقت نفس الامری، اس مآلِ زندگی، اس مقصدِ حیات، ان اصولِ اخلاق، ان اصولِ تمدن اور ان حدودِ عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں، جن کی تعیین اس ''الدّین'' میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجیے کہ کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے، جن سے وہ خود اپنے لیے ایک ایسا ''الدّین'' وضع کر سکے؟

انسانی ذرائع کا جائزہ

انسان کے پاس اپنا ''دین'' یا طریقِ زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے، دوسرا عقل، تیسرا مشاہدہ و تجربہ ہے اور چوتھا ذریعہ پچھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ۔ غالباً ان کے سوا کسی پانچویں ذریعے کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ ان چاروں ذرائع کا جتنا مکمل جائزہ لے کر آپ دیکھ سکتے ہیں، دیکھیے کہ آیا یہ ''الدین'' کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ اس کی تحقیق میں صرف کیا ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع ''الدّین'' کی ایجاد میں تو مدد نہیں دے سکتے، البتہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما ''الدین'' کو پیش کر دے، تو اسے سمجھنے، پرکھنے، پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتب کرتے رہنے میں ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

خواہش

پہلے خواہش کو لیجیے۔ کیا یہ انسان کی رہنما بن سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اصلی محرک عمل ہے مگر اس کی عین فطرت میں جو کمزوریاں موجود ہوں ان کی بناء پر یہ رہنمائی کے قابل

ہرگز نہیں ہوسکتی۔ تنہا رہنمائی کرنا تو درکنار عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جائے، بہر حال آخری فیصلہ جب کبھی اس پر چھوڑا جائے گا یہ بلا مبالغہ ۹۹ فی صدی حالات میں غیر مستقیم ہی فیصلہ کرے گی، کیونکہ اس کے اندر جو تقاضے پائے جاتے ہیں، وہ اس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس سے مطلوب کسی نہ کسی طرح جلدی اور بآسانی حاصل ہوجائے۔ یہ نفس ''خواہشِ انسانی'' کی طبعی کمزوری ہے۔ لہٰذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو، یا ایک طبقے کی ہو، یا وہ خواہش عام General will ہو جس کا روسو نے ذکر کیا ہے، بہر حال کسی قسم کی انسانی خواہش میں بھی فطرۃً یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایک ''الدین'' کے وضع کرنے میں مددگار بن سکے، بلکہ جہاں تک مسائلِ عالیہ Ultimate problem مثلاً حیاتِ انسانی کی حقیقت، اس کے مآل اور اس کی غایت کا تعلق ہے، اس کو حل کرنے میں تو وہ کسی طرح مددگار بن ہی نہیں سکتی۔

عقل

پھر عقل کو لیجیے۔ اس کی تمام بہترین صلاحیتیں مسلّم، انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار اور یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے، لیکن قطعِ نظر اس سوال کے کہ انسان کے لیے ''الدین'' کس کی عقل وضع کرے گی، زید کی؟ بکر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اس زمانے کے لوگوں کی؟ یا کسی پچھلے زمانے والوں کی؟ یا آیندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ نفس ''عقلِ انسانی'' کے حدود کا جائزہ لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''الدّین'' کے وضع کرنے میں اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اس کے تمام فیصلے منحصر ہیں اس مواد پر، جو حواس اس کو فراہم کرکے دیں۔ وہ غلط مواد فراہم کرکے دیں گے، تو یہ غلط فیصلہ کردے گی، وہ ناقص مواد فراہم کرکے دیں گے، تو یہ ناقص فیصلہ کردے گی اور جن امور میں وہ کوئی مواد فراہم کرکے نہ دیں گے، ان میں اگر یہ خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہ کرے گی، اور اگر برخود غلط ہے تو اندھیرے میں چوپائی تیر چلاتی رہے گی۔ یہ محدودیتیں جس بیچاری عقل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، وہ آخر کس طرح اس کی اہل ہوسکتی ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے ''الدین'' بنانے کی تکلیف اسے دی جائے۔ ''الدّین'' بنانے کا انحصار جن مسائلِ عالیہ کے حل پر ہے، ان میں حواس سرے سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے پھر کیا ان مسائل کا فیصلہ تخیلات،

لاطائل قیاسات اور مجرد اوہام سے کیا جائے گا؟ ''الدّین'' بنانے کے لیے، جن مستقل اخلاقی قدروں کا تعین ناگزیر ہے۔ ان کے لیے حواس بہت ہی ناقص مواد فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ناقص مواد پر صحیح و کامل قدریں متعین کرے گی؟ اسی طرح ''الدّین'' کے جو دوسرے اجزائے ترکیبی میں نے بیان کیے ہیں، ان میں سے کسی ایک جز کے لیے بھی حواس سے بالکل صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہوسکتا، جس کی بنا پر عقل ایک جامع اور مکمل نظام بناسکے اور اس پر مزید یہ ہے کہ عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا ہے۔ جو اسے ٹھیٹھ عقلی فیصلے دینے سے روکتا ہے، اور اس کی راست روی کو کچھ نہ کچھ ٹیڑھ کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ عقلِ انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی، تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ اتنا بل بوتا نہیں رکھتی کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جاسکے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر ظلم بھی کرنا ہے اور خود اپنے اوپر بھی۔

سائنس

اب تیسرے ذریعے کو لیجیے، یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس علم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے میں کسی طالب علم سے پیچھے نہیں ہوں۔ نہ ذرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ وسعت دینا جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ ''علمِ انسانی'' کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہوگی، وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا، جہاں تک مسائلِ عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کنہ تک اس کی رسائی محال ہے، کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں، جن سے وہ اس تک پہنچ سکے۔ نہ وہ اس کا براہِ راست مشاہدہ کرسکتا ہے اور نہ مشاہدہ و تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کر کے اس کے متعلق ایسی رائے قائم کرسکتا ہے، جس پر علم کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ لہٰذا الدّین وضع کرنے کے لیے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے، وہ تو علم کی دسترس سے باہر ہی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اخلاقی قدریں، تمدن کے اصول اور بے راہ روی سے بچانے والی حدود متعین کرنے کا کام، آیا علم کے حوالے کیا جاسکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص کا یا کس گروہ یا کس زمانے کا علم انجام دے گا۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لیے ناگزیر شرائط کیا ہیں، اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ ان تمام قوانینِ فطرت کا علم حاصل ہو جن کے تحت انسان اس دنیا میں جی

رہا ہے۔ اس کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں، وہ مکمل ہوں، اس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم یعنی کائناتی اور لسانیات کے علوم کی معلومات یکجا ہوں، اور کوئی ذہنِ کامل اس کو صحیح ترتیب دے کر ان سے صحیح استدلال کر کے انسان کے لیے اخلاقی قدروں، تمدن کے اصولوں اور بے راہ روی سے بچانے والی حدوں کا تعین کرے۔ یہ شرائط نہ اس وقت تک پوری ہوئی ہیں، نہ امید کی جاتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پوری ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ انسانیت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پوری ہو جائیں۔ مگر اس وقت اس کا فائدہ ہی کیا ہوگا۔

تاریخ

آخر میں اس ذریعۂ علم کو لیجیے جس سے ہم پہلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامۂ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں اور غور کریں گے تو آپ بھی مان لیں گے کہ الدّین وضع کرنے کا عظیم الشان کام انجام دینے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ ماضی سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے الدّین وضع کرنے کے لیے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنایا جائے گا؟ ہیگل کے ذہن کو؟ مارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماضی، حال یا مستقبل میں کس تاریخ تک کا ریکارڈ ایک الدین وضع کرنے کے لیے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں، باقی رہے اس سے پہلے گذر جانے والے، تو ان کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مایوس کن نتیجہ

یہ مختصر اشارات جو میں نے کیے ہیں، مجھے توقع ہے کہ میں نے ان میں کوئی علمی استدلالی غلطی نہیں کی ہے اور اگر انسان کے ذرائع کا جائزہ، جو میں نے لیا ہے، صحیح ہے تو پھر ہمیں کوئی چیز اس یقین تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی کہ انسان اپنے لیے کوئی کچا پکا، غلط سلط وقتی اور مقامی دین تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ چاہے کہ الدین وضع کر سکے تو یہ قطعی محال ہے۔ پہلے بھی محال تھا، آج بھی محال ہے اور آیندہ کے لیے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔

اب اگر کوئی خدا رہنمائی کے لیے موجود نہیں، جیسا کہ منکرینِ خدا کا خیال ہے، تو انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ خودکشی کر لے۔ جس مسافر کے لیے نہ کوئی رہنما موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اس کے لیے یاس اور کامل یاس کے سوا کچھ مقدر نہیں۔ اس کا کوئی ہمدرد اس کے سوا اسے اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ سرِ راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کر لے اور اگر خدا ہے، لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلسفیانہ اور سائنٹیفک طرز کے مثبتینِ خدا کا گمان ہے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورتِ حال ہے۔ جس خدا نے موجوداتِ عالم کی بقاونشوونما کے لیے ہر اس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے جس کی ضرورت کا تصور کیا جا سکتا ہو، لیکن نہیں ایک کیا تو صرف انسان کی سب سے بڑی ضرورت کا انتظام جس کے بغیر نوع کی زندگی غلط ہوئی جاتی ہے، اس کی بنائی ہوئی دنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے، ایسی سخت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مصیبت کا تصور ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دکھی جنتاؤں کی مصیبت پر کیا روتے ہیں۔ روئیے اس پوری نوع کی مصیبت پر جو اس بے چارگی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کر کے ناکام ہوتی ہے۔ ٹھوکریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھوکر کھائے۔ ہر ٹھوکر پر ملک کے ملک اور قومیں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، اس غریب کو اپنے مقصدِ زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کاہے کے لیے سعی و عمل کرے اور کس ڈھنگ پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے، جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے مگر وہ بس پیدا کرنے سے مطلب رکھتا ہے۔ رہنمائی کی پروا نہیں کرتا۔

امید کی ایک ہی کرن

اس تصویر کے بالکل برعکس قرآن ہمارے سامنے صورتِ حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا کر دینے والا ہی نہیں ہے، بلکہ رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجوداتِ عالم میں ہر چیز کو وہ ہدایت بخشی ہے، جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کے لئے ضروری ہے:

الَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ: ۵۰)

(جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا)

اگر اس کا ثبوت چاہو تو جس چیونٹی، جس مکھی، جس مکڑی کو چاہو پکڑ کر دیکھ لو۔ وہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ خود سری چھوڑ کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور جس جامع اور مکمل نظامِ زندگی یا الدّین کی ہدایت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجی ہے، اس کی پیروی اختیار کرے۔

دیکھیے ایک طرف تو وہ نتیجہ ہے جو انسان کی قوتوں اور اس کے ذرائع کا جائزہ لینے سے ہم کو حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ یا تو اس دعوے کو قبول کریں یا پھر اپنے آپ کو مایوسی اور اس مایوسی کے حوالے کر دیں جس کے اندھیرے میں برائے نام بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ دراصل صورتِ حال یہ ہے ہی نہیں کہ الدّین حاصل ہونے کے دو وسیلے موجود ہوں اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلے سے مدد لیں۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ الدّین جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے، وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہم اس تنہا وسیلے سے مدد لیں، یا اس کی دستگیری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیں۔

قرآن کے دلائل

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے، وہ تو ہم کو محض اس حد تک پہنچتا ہے کہ ہماری فلاح کے لیے قرآن کے اس دعوے کو قبول کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو۔ لیکن قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے، وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ و اشرف ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیں بادلِ نخواستہ مسلمان ہونے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں چار سب سے زیادہ پُر زور ہیں اور ان ہی کو اس نے بار بار بتکرار پیش کیا ہے۔

۱۔ انسان کے لیے اسلام ہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے اس لیے کہ یہی حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا رویّہ خلافِ حقیقت ہے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آلِ عمران: ۸۳)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالانکہ وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں چارو ناچار اسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اسی کی طرف انھیں پلٹ کر جانا ہے۔

۲۔ انسان کے لیے یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے، کیونکہ یہی حق ہے اور از روئے انصاف اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہوسکتا۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (الاعراف:۵۴)

حقیقت میں تمہارا رب (مالک وفرماں روا) اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دوروں میں پیدا کیا اور پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوا جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے، سورج اور چاند تارے سب کے سب جس کے تابعِ فرمان ہیں سنو! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔ بڑا برکت کرنے والا ہے وہ کائنات کا رب۔

۳۔ انسان کے لیے یہی رویہ صحیح ہے۔ کیونکہ تمام حقیقتوں کا صحیح علم صرف خدا کو ہے اور بے خطا ہدایت صرف وہی کرسکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ (آلِ عمران:۵)

درحقیقت اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ آسمانوں کی۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ (البقرۃ:۲۵۵)

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر بھی حاوی نہیں ہوسکتے۔ بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی (البقرۃ:۱۲۰)

اے پیغمبرؐ کہہ دو کہ اصلی ہدایت صرف خدا ہی کی ہدایت ہے۔

۴۔ انسان کے لیے یہی ایک راہِ راست ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر عدل ممکن نہیں۔ اس کے سوا جس راہ پر بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم ہی کی طرف جائے گی۔

وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (البقرۃ:۲۲۹)

جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوۡنَ۔ (المائدہ:۴۵)

جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں۔

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر ایک معقول انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور ہدایت کے لیے اس کی طرف رجوع کرے۔

خدائی ہدایت کے پرکھنے کا معیار

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لازماً اس مرحلے پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران میں، خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اس شخص کی بات مان لیں جو ایک دن ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے، جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا، جو انسانی فکر اور خدائی فکر کو ممیز کرتے ہیں۔

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے، جو چیز خدا کی طرف سے ہو گی اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا، مگر اس معیارِ تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جائے کہ علم اور علمی قیاس اور نظریۂ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں اکثر غلطی سے ان کو ''علم'' سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے غلط ہونے کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخِ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر ''علم'' ثابت ہوئے ہیں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے۔ اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نکلی ہوئی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہو گا جیسے اس کا مصنف ازل سے ابد تک دیکھ رہا ہے۔ تمام حقیقتوں کو بیک نگاہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے سے بڑے فلسفی اور مفکر کی فکر بھی ایک بچے کی فکر محسوس ہو گی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش، جذبات و خواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں ساز باز اور مصالحت کرتی نظر آ ہی جاتی ہے۔ بہ خلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت اور خالص دانشمندی کی شان اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ نظامِ زندگی وہ خود تصنیف کرے گا۔ اس میں جانب داری، انسان اور انسان کے درمیان غیر عقلی امتیاز، اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علیٰ بعض کا عنصر لازماً پایا جائے گا۔ کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں، جو بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں۔ بر خلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظامِ زندگی ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہوگا۔ اس معیار پر آپ ہر اس نظامِ زندگی کو جانچ کر دیکھیے جو اپنے آپ کو خدا کی طرف سے الدین کہتا ہو۔ اگر وہ انسانی فکر کی ان تمام خصوصیات سے خالی ہو اور پھر جامعیت اور ہمہ گیری کی شان بھی رکھتا ہو جو اس سے پہلے میں نے الدین کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تأمل کریں۔

ایمان کے تقاضے

اب مجھے اپنے خطبے کے بنیادی سوالات میں آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرلے اور اس الدّین پر ایمان لے آئے جس کے من جانب اللہ ہونے کا اطمینان اسے حاصل ہو گیا، تو اس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے، سپر ڈال دینے، اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپر اندازی کے ساتھ خود رائی، خود مختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں نبھ سکتی۔ جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں۔ آپ کو اپنی پوری شخصیت اس کے حوالے کر دینی ہوگی، اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو۔ آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو، آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو، آپ کے پیٹ اور دھڑ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، آپ کی محبت اور نفرت کا دین ہو، آپ کی دوستی اور دشمنی کا دین ہو، غرض آپ کی شخصیت کا کوئی جز اور کوئی پہلو

بھی اس دین سے خارج نہ ہو۔ جس چیز کو بھی جتنا اور جس حیثیت سے آپ اس دین کے احاطے سے باہر اور اس کی پیروی سے مستثنٰی رکھیں گے، سمجھ لیجیے کہ اسی قدر آپ کے دعوائے ایمان میں جھوٹ شامل ہے اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر یہ بھی میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کُل ہے جسے شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا انسان کی پوری زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ دو دو اور تین تین دینوں کی بیک وقت پیروی بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایمان کے ڈانواں ڈول اور عقلی فیصلے کے مضطرب ہونے کا ثبوت ہے۔ جب فی الواقع کسی دین کے الدّین ہونے کا اطمینان آپ حاصل کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو لازماً اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیے۔ اگر وہ شخصی حیثیت سے آپ کا دین ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو، آپ کی تربیتِ اولاد کا، آپ کی تعلیم اور آپ کے مدرسے کا، آپ کے کاروبار اور آپ کی معاش کا، آپ کی مجلسی زندگی اور قومی طرزِ عمل کا، آپ کے تمدن اور سیاست کا، آپ کے ادب اور آرٹ کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک موتی اپنی جگہ تو موتی ہو، مگر جب تسبیح کے رشتے میں بہت سے موتی منظم ہوں، تو سب مل کر دانۂ نخود بن جائیں۔ اسی طرح یہ بات بھی میرے دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں، مگر جب اپنی زندگی کو منظم کریں، تو اس منظم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنٰی رہ جائے۔

اِن سب سے بڑھ کر ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے الدّین ہونے پر آپ ایمان لے آئیں، اس کی برکتوں سے ابنائے نوع کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی و جدو جہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی الدّین تمام دنیا کا دین بن جائے جس طرح حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح حق پرستی کی بھی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق کو جان لینے کے بعد باطل پر اسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص دیکھ رہا ہو کہ باطل ہر طرف زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے، اور پھر یہ منظر، اس کے اندر کوئی بے کلی، کوئی چبھن، کوئی تڑپ، پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے بھی تو سوئی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہئے کہ یہ نیند کا سکوت کہیں موت کے سکوت میں تبدیل نہ ہو جائے۔

باب سوم:

اسلامی نظریہ (Islamic Ideology)

اسلامی نظریۂ کیا ہے؟

(1) اسلامی نظریات کی بنیادیں

(2) فرد اور معاشرہ

(3) اسلامی معاشرت کا تصور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

پروفیسر خورشید احمد عہدِ حاضر کے ایک معروف و ممتاز عالمِ معاشیات اور اسلامی دانش ور ہیں۔ وہ اپنے قلم کے زور اور فکر کی گہرائی کی وجہ سے ہر مکتبِ فکر میں مقبول ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ـــــ اسلامی نظریہ ـــــ دراصل ان کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی کے "نظریۂ پاکستان نمبر" کے لیے اب سے چونتیس برس پہلے دسمبر ۱۹۶۰ء میں سپردِ قلم فرمایا تھا۔

مقالہ نگار نے سب سے پہلے آئیڈیولوجی کی تعریف بیان کی ہے، اس کے بعد بتایا ہے کہ یہ اصطلاح کب اور کن معنوں میں استعمال ہوئی اور اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اس ضمن میں انسانوں کے دوسرے نقطہ ہائے نظر کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ اب جب ہم اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ سیاسی اور معاشی لائحۂ عمل مراد لیتے ہیں، جو اسلام پیش کرتا ہے۔ پھر اسلامی آئیڈیولوجی کی بنیادوں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اسے الہامی آئیڈیولوجی سے تعبیر کیا ہے۔

آخری حصے میں فرد اور سماج سے متعلق اسلامی آئیڈیولوجی کی اہمیت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے تحریکِ اقامتِ دین کا اصولی اور سائنٹی فک تعارف کرایا گیا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ ضخامت کے لحاظ سے مختصر ہے لیکن اہمیت کے اعتبار سے بہت سی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے۔ ان شاء اللہ اسلام کو سائنٹی فک اصولوں پر سمجھنے والے طلبہ اور اسکالرس کے لیے یہ مفید اور معاون ثابت ہوگی۔

(ناشر)

(۱)

آئیڈیولوجی کسے کہتے ہیں

آئیڈیولوجی (Ideology) کا لفظ انگریزی زبان میں غالباً اٹھارویں صدی کے اخیر سے مستعمل رہا ہے۔ شروع میں یہ لفظ "علم التصورات" (Science of Ideas) کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور خصوصیت سے اس سے مراد فلسفہ اور نفسیات کا وہ شعبہ تھا، جو تصورات، ان کی حقیقت و ماہیت اور ان کے آغاز و مآخذ کا مطالعہ کرے۔ اس معنیٰ میں اس اصطلاح کو ڈبلیو ٹیلر نے اپنے اس مقالے میں استعمال کیا تھا، جو اس نے ۱۷۹۶ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فرانس میں پیش کیا تھا۔ بعد میں اس لفظ نے ایک نئی معنویت اور اس کے مفہوم نے مزید وسعت اختیار کرلی۔ جدید ادب میں اسے ایک ایسے ضابطۂ عمل اور اجتماعی پروگرام کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، جو اپنی فلسفیانہ بنیادیں بھی رکھتا ہو اور سیاست و معاشرت کے لیے بھی ایک لائحۂ عمل پیش کرتا ہو۔

"لغتِ فلسفہ" میں ڈاکٹر جارج بوآس اس کی یہ تعریف کرتے ہیں:

"عام نظریات کا کوئی ضابطہ یا کوئی ایسا پروگرام جس کی اساس فکر و فلسفہ پر ہو۔[۱]"

اسی طرح مشہور ماہرِ لسانیات ویبسٹر اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

کسی تہذیبی، سیاسی یا معاشرتی تحریک کے عام منصوبہ یا لائحۂ عمل کا علمی بیان۔[۲]

ان تعریفات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آئیڈیولوجی سے کسی بھی تحریک یا نظامِ تمدن کا تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی پروگرام و لائحۂ عمل مراد ہے اور جب ہم "اسلامی

(۱) Dictionary of Philosophy Ed. D.D. Runer. Philosophical Library, New York, P.140

(۲) Webster's Approved Dictionary 1948, Edition.

آئیڈیولوجی'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ سیاسی اور تمدنی لائحۂ عمل مراد ہوتا ہے، جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ آئیڈیولوجی کی اصل خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے خاص نظامِ فکر کی روشنی میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق رہ نمائی کرتی ہے اور جس طرح ہار کے موتیوں کو ایک سرشتہ باہم منسلک کر دیتا ہے، اسی طرح ہر آئیڈیولوجی کی ایک مشترک اپروچ زندگی کے تمام شعبوں کے پروگراموں کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیتی ہے۔ ہر شعبے میں ایک ہی روح اور ایک ہی فکر کار فرما ہوتی ہے اور اس طرح ایک مکمل ضابطۂ فکر و عمل رونما ہوتا ہے، جس میں زندگی کی حقیقی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں حیات کے تمام پہلوؤں میں یک رنگی اور ہم آہنگی رونما ہوتی ہے اور اس یک رنگی سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔

یورپ کی بدقسمتی رہی ہے کہ وہ ایک عظیم مدت سے کسی حیات بخش آئیڈیولوجی سے محروم رہا ہے۔ عیسائیت اسے کوئی آئیڈیولوجی نہ دے سکی اور ترک عیسائیت کے بعد وہ آئیڈیولوجی اور اس کی ضرورت ہی کا منکر ہو گیا۔

جدید مغربی فکر کا ارتقاء جن خطوط پر ہوا ہے، وہ زندگی کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے ہیں۔ سب سے پہلے ڈیکارٹ نے روح اور مادّے کی وحدت کا ابطال کیا۔ اس کے فلسفۂ ثنویت میں روح اور مادہ ''Substances'' ہیں۔ لائبنیز نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور وجود کی کثرت کا نظریہ پیش کیا۔ اب ہر جوہر (Monad) خود ایک کائنات تھا اور اپنا جداگانہ وجود رکھتا تھا اور اپنی مخصوص نظر سے پوری کائنات کی عکاسی کر رہا تھا۔ لاک اور ہیوم کے زیرِ اثر کمیت (Quantity) کی اہمیت بڑھ رہی تھی اور کیفیت (Quality) کی اہمیت کم ہو رہی تھی۔ طبعیات اور حسابیات کی ترقی نے اس عمل کو اور بھی تیز تر کر دیا اور نتیجۃً مغربی فکر کی سب سے اہم خصوصیت ''کل'' سے ''جزو'' کی طرف مراجعت ہوگئی۔ اس کیفیت کو جدید اہلِ قلم جوہری حسیّت (Atomic Sensational) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اسی فکری پس منظر کا نتیجہ تھا کہ ندگی کے ہر شعبے میں انتشار اور جزو پرستی رونما ہوئی۔ عالمی ریاست کا تصور قومی ریاست کے صور سے بدل گیا اور سلطنت روما چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں بٹ گئی۔ مذہب اور سیاست کو ک دوسرے سے بالکل جدا کیا گیا اور سیاست میں بھی انفرادیت (Individu alism) کا یہ ہوا جو جمہوریت پر منتج ہوا۔ معاشیات میں تخصیص (Specialisation) اور تقسیم پسندی

(Departmentalisation) کا رجحان رونما ہوا اور پوری صنعتی اور تجارتی ترقی انھی خطوط پر ہوئی۔ نیشنلزم، سیکولرزم، جمہوریت، صنعت (Industrialism) اسی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

مغربی فکر کے اس رجحان کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا کہ کوئی ایک آئیڈیولوجی ایسی نہیں ہو سکتی تھی، جو زندگی کے تمام شعبوں میں یک رنگی پیدا کر سکے۔ لادینیت (Secularism) یا مادیت (Materialism) اور لبرلزم منفی تحریکیں تھیں۔ وہ کوئی مثبت آئیڈیولوجی فراہم نہیں کر سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعبے کا ارتقاء جدا جدا بنیادوں اور مختلف تمدنی خطوط پر ہوا اور زندگی میں کوئی وحدت باقی نہ رہی۔ معیشت کسی سمت میں جا رہی ہے؛ تو معاشرت کسی اور سمت میں —— سیاست کا انداز کچھ ہے تو اخلاق و تمدن کا کچھ اور۔ ہر معاملے میں متعدد معیارات بن گئے اور کوئی ایک پیمانہ ایسا نہ رہا، جس سے حیات کے ہر پہلو کو ناپا جا سکے۔ یورپ کی زندگی کا جدید انتشار اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک مندرجہ بالا حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔ تاریخ کا طالب علم جب یہ دیکھتا ہے کہ ریاست میں جمہوریت اور معاشیات میں صنعتی استبداد اور مزدوروں پر مظالم ساتھ ساتھ رونما ہوئے ہیں۔ جب وہ لبرلزم اور امپیریلزم کو ہم آغوش دیکھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تضاد و تناقض اس لیے تھا کہ ایک منفی چیز پر تو سب مشترک تھے، لیکن کوئی مثبت آئیڈیولوجی ایسی موجود نہ تھی، جو زندگی کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے ایک علمی اور عملی لائحۂ عمل دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعبے میں مختلف سمتوں میں ترقی ہوئی ہے اور آج اس کے نتیجے میں مغربی تہذیب اندرونی انتشار کا شکار ہے۔

یورپ کی جدید تاریخ میں اسی انتشار اور ژولیدگی کے ردِعمل کے طور پر اشتراکیت بحیثیت ایک آئیڈیولوجی اور ایک تحریک کے رونما ہوئی اور جو بھی کامیابی اس کو آج کی دنیا میں حاصل ہوئی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کے پاس ایک آئیڈیولوجی، ایک ضابطۂ حیات ہے۔ اسی میں اس کی اپیل کا اصل راز مضمر ہے۔ لیکن چوں کہ اشتراکیت بھی مغربی فکر کی منفی رَو سے اپنے کو آزاد نہ کر سکی اور مادہ و روح اور زندگی و اخلاق کی تقسیم پر مبنی ہے اور انسانی سماج کی طبقاتی تقسیم پر اس کی اساس ہے، اس لیے اس نے ایک پروگرام تو دیا مگر ایک صحت مند اور حیات بخش پروگرام پیش کرنے سے وہ بھی قاصر رہی۔ جس وقت تک وہ محض ایک نظریہ رہی، اس کی اپیل دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی رہی۔ لیکن اب جب کہ اس کے عملی نتائج بھی سامنے

آگئے ہیں اس کی اپیل برابر کم ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ انسان یہ دیکھ رہا ہے کہ : ؎

زمامِ کار گر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ایک طرف تو جدید دنیا میں کسی صحت بخش آئیڈیولوجی کا فقدان ہے اور دوسری طرف ایک ایسی آئیڈیولوجی کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ انسان کی شخصیت ایک ہی ہے اور وہ بیک وقت ڈاکٹر جیکائل اور مسٹر ہائیڈ نہیں بن سکتا اور اگر بنے گا تو اس کی شخصیت انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان ایک انتشار زدہ شخصیت (Split-personality) کا حامل ہے اور سماجی بے اطمینانی، معاشرتی کش مکش، نوجوانوں کی بے راہ روی (Juveniledelinquency) ذہنی امراض جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں وہ اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ حیاتِ انسانی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر شعبے کو ایک آزاد اور جداگانہ جزیرے کی شکل دے دینا نہایت مہلک ہے۔ انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور معاشی، معاشرتی اور تمدنی یہ تمام شعبے ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں بالکل الگ الگ حصوں (Compartments) میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح گلاب کی پنکھڑی میں یہ امتیاز کرنا دشوار ہے کہ سپیدی کہاں ختم ہوئی اور سرخی کہاں سے شروع ہوئی اسی طرح انسانی زندگی میں مختلف شعبوں کے درمیان امتیاز و تفریق ممکن نہیں۔ جب تک تمام شعبوں کو درست نہ کیا جائے اور سب میں ہم رنگی و ہم آہنگی نہ ہو اس وقت تک انسانی زندگی خوش حالی و کامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ ممکن نہیں کہ آپ کا صرف نصف چہرہ مسکرائے اور باقی نہ مسکرائے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف معیشت یا سیاست کی تنظیم بندی سے پوری زندگی سنور جائے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بیک وقت مختلف سمتوں میں چل سکے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کو بیک وقت مختلف منزلوں کی طرف سرگرم عمل کیا جا سکے۔ تجربے نے آج کے انسان کو یہ اچھی طرح سکھا دیا ہے کہ اگر وہ اپنی شخصیت کا استحکام اور تمدن کی حقیقی ترقی چاہتا ہے تو جزو پسندی (Departmentalisation) سے تہذیبی

وحدت کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت ایسی صحت مند آئیڈیولوجی ہے، جو دنیا کو اس انتشار سے نکال دے۔ جس میں وہ گھر گئی ہے اور جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔

یہ تہذیبِ انسانی کی اندرونی کیفیت ہی کا تقاضا نہیں بلکہ کچھ بیرونی اسباب بھی ایسے پیدا ہو گئے ہیں، جو اسے اس سمت میں کشاں کشاں لا رہے ہیں۔ پہلی چیز تو ریاست کا جدید تصوّر ہے۔ آج کی ریاست (ایک خاموش سیاسی انقلاب کے نتیجہ کے طور پر) ایک ہمہ گیر ریاست بن چکی ہے۔ جیمز اسٹورٹ مل اور لارڈ ملبورن کے تصور کی محض انتظامی ریاست (Police State) کا آج دنیا کے کسی کونے میں وجود نہیں۔ اب ریاست ایک مثبت ریاست ہے جسے تعلیم، کلچر، سماج، معیشت، نشر و اشاعت ہر میدان میں ایک پالیسی اختیار کرنی ہے اور ہر شعبے کی صورت گری کرنی ہے محض منفی تصورات کے سہارے ایسی کوئی ریاست قائم نہیں ہو سکتی۔ سیکولرزم اور لبرزم آج کے مسائل کا حل نہیں۔ مذہب کو آپ ٹکسال باہر کر بھی دیں تو کریں گے کیا؟ سیکولرزم کوئی مثبت پروگرام نہیں دیتا۔ لبرزم کے سہارے آپ ماضی کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں اور روایات کو ترک بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کا مثبت اقدام آخر کیا ہوگا؟ لبرزم کوئی مثبت آئیڈیولوجی نہیں دیتا۔ جمہوریت بھی زیادہ سے زیادہ آپ کو یہ بتاتی ہے کہ "وہ کرو جو عوام چاہیں۔" لیکن سوال یہ ہے کہ عوام کیا چاہیں؟ کوئی مثبت نظریہ، کوئی تعمیری لائحہ عمل جب تک عوام کے پاس نہ ہو وہ کیا کر سکتے ہیں؟ جس پہلو سے بھی آپ غور کریں گے آپ محسوس کریں گے کہ آج ایک طرف ہمارے زمانے کے چلتے ہوئے فلسفے آئیڈیولوجی فراہم کرنے میں ناکام ہیں تو دوسری طرف آج کی دنیا میں ریاست کے لیے آئیڈیولوجی اتنی ہی ضروری ہو گئی ہے، جتنی انسان کے لیے ہوا اور پانی۔ اس کے بغیر اس کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے سیاسی مفکرین بیسویں صدی کی ریاست کو "نظریاتی ریاست (Ideological State) کے نام سے پکارتے ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ فنی اور میکانکی ترقی نے اب ان تمام منتشر جزیروں کو آپ سے آپ ملا دیا ہے، جن میں اس سے پہلے زندگی کو تقسیم کیا گیا تھا۔ وسائلِ نقل و حرکت نے جغرافیائی فاصلوں کو کم بلکہ ختم کر دیا ہے۔ تعلیم، پروپیگنڈہ اور ریڈیو نے زندگی کے تمام شعبوں کو ملا دیا ہے۔ زمان و مکان کی تسخیر نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ اب پوری دنیا ایک شہر اور پوری

انسانیت ایک خاندان بنتی جا رہی ہے اور وحدت کی طرف اس کی اس پیش قدمی کے زمانے میں ''کثرت'' اور ''تقسیم'' کے وہ تمام فلسفے بیکار اور ازکار رفتہ ہوگئے ہیں، جو آج تک اس کا سرمایۂ حیات رہے ہیں۔ نیا زمانہ مغرب کے تمام جزوی فلسفوں کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے:۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے

اب دنیا کو ایک ایسے نظریے اور ایک ایسی آئیڈیولوجی کی ضرورت ہے، جو کثرت کو وحدت میں بدل دے اور ان نئے حالات میں انسان کو رہنے کا سلیقہ سکھائے۔ تاکہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی نئی قوتوں کو تعمیر و تشکیل کے لیے استعمال کرسکے۔ ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ آج تک انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ نفرت، تقسیم پسندی اور جزو پرستی کے فلسفوں کے ہاتھوں تباہ ہوجائے:

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی وہ نظامِ عمل پیش کرتی ہے، جو دورِ جدید کی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی دنیا کی تاریکی کو نور میں بدل سکتی ہے اور جدید جہالت کو بھی اسی طرح ختم کرسکتی ہے، جس طرح آج سے پہلے تاریخ کی قدیم جہالتوں کو ختم کرتی رہی ہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ (ابراہیم:۱)

الٓر۔ یہ کتاب (ہدایت) ہے، جس کو ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے کہ تم تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ اس خدا کے راستے کی طرف جو غالب اور ستودہ صفات ہے۔

(۲)

اسلامی آئیڈیولوجی کی بُنیادیں

اسلامی آئیڈیولوجی کے معاشرتی اور تمدنی پروگرام کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان بنیادوں کا مطالعہ کرلیا جائے، جو اس آئیڈیولوجی کے مخصوص مزاج کو متعین کرتی ہیں، اسے ایک خاص اندازِ کار دیتی ہیں اور اس کے دیے ہوئے لائحۂ عمل کو دوسرے تمام نظام ہائے فکر و عمل پر فوقیت عطا کرتی ہیں۔

الہامی ہدایت

۱۔ اسلامی آئیڈیولوجی کے متعلق سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ الہامی ہدایت پر مبنی ہے۔ اسے کسی انسان کے ذہن نے تخلیق نہیں کیا۔ یہ اسی خالق کی طرف سے ہے، جس نے زمین و آسمان کو اور خود انسان کو پیدا کیا ہے۔ یہ کائنات محض ایک اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کا ایک خاص خالق اور پیدا کرنے والا ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس خالق نے اپنی زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا ہے تاکہ یہ دیکھے کہ انسان اپنے فرائضِ منصبی کو کس خوبی سے انجام دیتا ہے۔ رب العالمین نے انسان کی ہر قسم کی ضرورت کو پورا کرنے کا سامان بھی کردیا ہے۔ انسان کی مادی اور جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے سینۂ کائنات میں بے شمار وسائل ودیعت کردیے ہیں اور انسان کو اس بات کی طاقت دی ہے کہ وہ محنت اور جستجو کے ذریعے ان سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرے اور انسان کی اخلاقی، روحانی اور تمدنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے رب السمٰوات والارض نے اپنے پیغمبر بھیجے۔ انھوں نے انسانوں کو الہامی ہدایت پہنچائی اور اس کے مطابق عملاً نظامِ زندگی کو قائم کیا۔ نبیوں کی لائی ہوئی یہی

ہدایت اسلام ہے۔ تخلیق و رہ نمائی کے اس نظام کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ: ۵۰)

(حضرت موسیٰ نے) فرمایا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی اور پھر رہ نمائی فرمائی۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف: ۵۴)

دیکھو! سب مخلوق بھی اس کی ہے اور حکم (قانونِ ہدایت) بھی اسی کا ہے یہ خدائے رب العٰلمین بڑی برکت والا ہے۔

خدا نے انسان کی رہ نمائی کے لیے پورا دین نازل کیا ہے اور اسی دین کے تمدنی پروگرام کا نام اسلامی آئیڈیولوجی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ محض کسی چیز کے اسلام کے نام پر پیش کر دینے سے وہ شے اسلامی آئیڈیولوجی کا جز نہیں بن جاتی۔ اسلامی آئیڈیولوجی کا جز وہی چیزیں ہیں، جو خدا اور اس کے رسول نے ہم کو بتائی ہیں یا جو ہم اس طریقے پر معلوم کریں جو خدا نے ہم کو بتایا ہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی کے اولین ماٰخذ قرآن اور سنت رسول اللہ ہیں۔ ہر وہ چیز جس کی سند قرآن و سنت میں ہے، آئیڈیولوجی کا جزو ہے۔ اور جس کی سند اس میں نہیں ہے وہ اس آئیڈیولوجی کا کوئی مستقل حصہ نہیں۔ قرآن اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے اور یہ اسلامی نظریے کا اولین ماخذ ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ

(الاعراف: ۳)

لوگو! جو (کتاب) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔

قرآن کے ساتھ ہمیں رسول کی اطاعت کا حکم ہے۔ رسولؐ کی زندگی کو انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ بنایا گیا ہے اور اس کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (سورۃ النساء: ۸۰)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے یقیناً خدا کی اطاعت کی۔

رسولؐ کی سنت کو ہم قرآن، تواتر، حدیث اور عملِ صحابہؓ سے معلوم کرتے ہیں اور خدا کے رسولؐ کی یہی سنت اسلامی آئیڈیولوجی کا دوسرا مستقل ماخذ ہے۔ خود حضور اکرم ﷺ نے اسلامی آئیڈیولوجی کی انھیں بنیادوں کا ذکر اپنے آخری خطبے میں فرمایا تھا:

"میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں، جن کے بعد پھر تم گم راہ نہیں ہو سکتے۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری سنت۔" (متفق علیہ)

اسلامی آئیڈیولوجی کی یہی الہامی نوعیت ہے، جس کی بنا پر بدعت کو گم راہی کہا گیا ہے۔ دین میں ایسا مستقل اضافہ، جس کی اصل ماخذ میں کوئی سند نہیں۔ بدعت ہے۔ بقول امام مالکؒ:

من ابتدع فی الاسلام البدعة یراها حسنةً فقد زعم ان محمدا ﷺ خان الرسالة فانّ الله سبحانه یقول الیوم اکملت لکم دینکم فمالم یکن یومئذٍ دیناً فلایکون الیوم دیناً۔

جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کی اور اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، (گویا) وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمدؐ نے (نعوذ باللہ) پیغام پہنچانے میں خیانت کی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ جو بات عہد رسالت میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔

اسلامی آئیڈیولوجی کی یہی خصوصیت اسے باقی تمام نظریات سے مختلف کر دیتی ہے۔ اس نظام میں کسی کے لیے بھی خود اپنی طرف سے کسی بات کے بڑھانے کا امکان نہیں ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی ہدایت کو قایم کرے نہ یہ کہ اس کے نام پر اپنی من مانی باتیں پیش کرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو روانہ کرتے وقت اس بات کا اظہار فرمایا تھا:

"میرا مقام صرف متبع کا ہے۔ میں بہ ہر حال کوئی نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ پس اگر نبی کی راہ پر استوار ہوں تو میری پیروی کرنا اور اگر راہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے راہ راست پر لے آنا۔" اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بار خلافت اٹھاتے وقت اس بات کا اظہار اس طرح کیا تھا:

"لوگو! یہ ایک حقیقت ہے کہ تمہارے نبیؐ کے بعد کوئی نبیؐ نہیں آئے گا اور نہ کوئی کتاب اس کتاب

کے سوا اترے گی جو تمہارے نبیؐ پر اتری۔ اللہ عزوجل نے جو حلال کردیا ہے، وہی حلال ہے جو حرام کردیا ہے، وہی حرام ہے اور یہ حرمت قیامت تک کے لیے ہے۔ اے لوگو! یاد رکھو میں قاضی بن کر اس مسند پر نہیں بیٹھا۔ میں تو احکام الٰہی کا نفاذ کرنے والا ہوں۔ میں کسی نئی بات کا داعی نہیں ہوں۔ میں تو احکام الٰہی کے تابع ہوں۔ لوگو! یاد رکھو! کسی کو زیب نہیں دیتا کہ خدا کے احکام کے خلاف باتوں میں اس کی پیروی ہو۔ میں اگر اللہ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت ضرور جانو اور اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو میری بات نہ مانو۔"

اس بحث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی انسانوں کی بنائی ہوئی آئیڈیولوجی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ماخذ زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی ہدایت ہے۔ یہ قرآن اور سنت رسول اللہ پر مبنی ہے اور جو چیز ان سے ٹکرائے، اس کے لیے اس میں کوئی گنجایش نہیں۔ اس کا اصولِ اطاعت یہ ہے کہ خدا کی اطاعت کرو اور خدا کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان اصحاب امر کی اطاعت کرو جو خدا کی ہدایت کے مطابق عمل کریں اور معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں۔ ضمناً اس سے یہ غلط فہمی بھی دور ہوجاتی ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی وہ ہے، جو مسلمانوں کی آئیڈیولوجی ہو۔ بلا لحاظ اس کے کہ وہ قرآن وسنّت کے مطابق ہے یا ان سے متصادم۔ یہ نظریہ مستشرقین سے مسلمانوں میں آیا ہے۔[1] قرآن وسنت میں اس کے لیے کوئی سند نہیں۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ غلط فہمی دور ہوجاتی ہے اور پھر قرآن کی اس واضح آیت کے بعد تو اس کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ اگر مسلمان اسلام پر عمل نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی اور قوم پیدا کردے گا، جو اس کی علم بردار ہوجائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ (المائدۃ: ٥٤)

اے مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ اس سے دین کو کچھ نقصان ہوگا) عن قریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کردے گا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور جو اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

---

(۱) پروفیسر ولفریڈ اسمتھ نے Modern Islam in India اور Am in Modern History میں اس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

ایمان - ایک انقلابی قوت

۲- اسلامی آئیڈیولوجی کی دوسری بنیاد ایمان ہے۔ ایمان خدا پر، اس کے رسولوں پر اور زندگی بعد موت پر۔ یہی ایمان اس کی فکری اور فلسفیانہ بنیاد ہے اور اسی ایمان کے سہارے وہ زندگی کی تعمیر کے پورے پروگرام پر عمل کراتی ہے۔

انسان اور جمادات وحیوانات میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر اپنے لیے ایک راستہ منتخب کرتا ہے اور جمادات وحیوانات اس "ارادہ" سے محروم ہیں۔ درختوں کے نشوو ارتقاء کا ایک راستہ متعین ہے اور وہ خود اس سے سرِ مو بھی نہیں ہٹ سکتے۔ دریاؤں کے بہنے کا ایک قانون مقرر ہے اور وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے۔ حیوانات جبلت کے تابع ہیں اور وہ اپنی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں لاسکتے۔ لیکن انسان کو شعور اور ارادہ دیا گیا ہے — وہ اپنا راستہ خود متعین کرتا ہے اور جو راستہ وہ متعین کرلیتا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کا ملکہ بھی اس کو دیا گیا ہے۔

اسلامی آئیڈیولوجی انسان کے اس شعور اور آزادی کے اعتراف پر مبنی ہے اور وہ اس کے سامنے یہ بات رکھتی ہے کہ انسانوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حیوانوں کی طرح بے سوچے سمجھے زندگی گزاریں۔ انسان کے سامنے دو راستے ہیں۔ خدا کی اطاعت کا راستہ اور خدا سے انکار کا راستہ۔ ایمان کا راستہ اور کفر کا راستہ۔ اور انسان کو ان میں سے کسی ایک کو پورے غور وفکر کے بعد قبول کرلینا چاہیے۔ اگر وہ ایمان کا راستہ قبول کرتا ہے؛ تو وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہوگا اور اگر کفر کا راستہ قبول کرتا ہے تو ناکامیاب۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَۚ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝ (الاحقاف: ۱۳، ۱۴)

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر قائم رہے تو نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں۔ یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور (یہ نعمت انہیں) ان اعمال کے صلے میں (حاصل ہوگی) جو وہ کیا کرتے تھے۔

خدا اس کے رسولؐ اور زندگی بعد موت پر ایمان انسان کی زندگی میں ایک انقلابی

کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے اور چوں کہ اسلامی آئیڈیولوجی تبدیلی کا محرک ہوتا ہے۔ چوں کہ اسلامی آئیڈیولوجی زندگی کے ہر شعبے میں یہ ایک ہی رنگ (صبغۃ اللہ) کو غالب کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اس کا نقطۂ آغاز ایمان پیدا کرنا ہے، جس کے معنی انسان کے فکر و نظر کی تبدیلی ہے۔ یہ سماجی، معاشی اور معاشرتی اصلاحات سے پہلے انسان کے دل کو بدلتی ہے۔ اس کی نگاہ کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے زاویۂ نظر اور سوچنے کے انداز کو تبدیل کرتی ہے۔ اسے ایک نیا نقطۂ خیال عطا کرتی ہے۔ تاکہ ہر انسان خود اپنی پوری زندگی کو خدا کی اطاعت کے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔

خدا کی ہدایت سے ہٹ کر جتنے بھی فلسفے وضع کیے گئے ہیں، ان سب کی مشترک کمزوری یہ ہے کہ وہ خارج میں تبدیلی کے تو متمنی ہیں، لیکن انسان کے اندر کسی تبدیلی کا منصوبہ نہیں پیش کرتے۔ وہ شاخوں سے تو ضرور نبرد آزما ہوتے ہیں مگر جڑوں کو محفوظ چھوڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ماحول کی درستی کی ہر ممکن کوشش کے باوجود برائی کا قلع قمع نہیں ہو پاتا۔ اگر ایک جگہ اسے دبا دیا جاتا ہے تو وہ دس نئے مقامات پر اُبھر آتی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے فسادِ خون کا تو علاج نہ کیا جائے اور پھوڑے پھنسیوں پر پھائے لگا لگا کر مرض کو دور کرنے کی کوشش کی جائے! اسلام اس نقطۂ نظر کے برخلاف پہلی ضرب جڑ ہی پر لگاتا ہے۔ وہ انسان کے دل و دماغ سے غیر اللہ کی عقیدت و محبت کو ختم کرتا ہے اور ایمان کو صرف خدا کے لیے خالص کر لیتا ہے۔ پھر جب ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور سوچنے کا انداز اور فکر و نظر کے زاویے بدل جاتے ہیں تو پھر انسان کی پوری شخصیّت تبدیل ہو جاتی ہے:

جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

اسلامی آئیڈیولوجی اصلاح کا آغاز ایمان کی درستی سے کرتی ہے۔ خدا کے نبی جس چیز کا سب سے پہلے مطالبہ کرتے ہیں وہ ایمان ہی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ایمان کے بغیر زندگی کی تعمیر کا کوئی سوال نہیں۔ نبی انسانوں سے کہتا ہے:

یٰاَیُّھَا النَّاس قولوا لَا اِلٰہَ الا اللّٰہ تفلحوا

اے لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس جبھی تم کامیاب ہو گے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یقبل اللّٰہ ایماناً بلا عملٍ ولاَ عملاً بلا ایمان۔

اللہ ایمان کو بغیر عمل کے قبول نہیں کرتا اور عمل کو ایمان کے بغیر قبول نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان سب سے بڑی قوت ہے اور کوئی تعمیری پروگرام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک اس کا نقطۂ آغاز ایمان کی اصلاح نہ ہو۔ خود تاریخ بھی اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب جو نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں برپا ہوا تھا اس کی کامیابی کا اصل راز ہی یہ تھا کہ خدا کے نبیؐ نے انسانوں کو ایک نیا ایمان دیا تھا اور پھر یہ ایمان ہی کی انقلابی قوت تھی کہ اس نے زندگی کے ہر شعبے کی قلب ماہیت کر دی۔ اس کی وجہ سے کسی جبر و استبداد کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ہر انسان کے دل میں خود ایک ایسی شمع روشن ہو گئی، جس نے بدی کی تاریکیوں کو چھانٹ دیا اور انسان کو ایک نیا روپ عطا کیا۔ اس کی وجہ سے ہر شخص خود اپنا نگراں بن گیا اور کسی بیرونی دباؤ کے بغیر وہ خود اپنا محاسبہ کرنے لگا۔ اس کی وجہ سے دنیا سے بے جا محبت آپ سے آپ ختم ہو گئی اور انسان نے اعلیٰ مقاصد کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ اس کی وجہ سے برائیوں سے نفرت کا داعیہ ہر فرد کے نفس میں پیدا ہو گیا اور وہ بدی کے خلاف ایک ہمہ گیر جہاد میں مصروف ہو گیا۔ یہ ایمان ہی کا کرشمہ تھا کہ ہمیں ایک نوجوان ایسا بھی نظر آتا ہے، جو حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں خود آتا ہے اور کہتا ہے کہ ”یا رسول اللہ! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں — مجھ پر حد جاری کر دیجیے۔“ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک خاتون نبی بزرگ و برترؐ کے دربار میں آتی ہے اور خود کہتی ہے۔ ”اے خدا کے فرستادہ! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے۔ مجھے پاک کر دیجیے۔“ یہ ایمان ہی کا ثمرہ ہے کہ ایک شخص کو کسریٰ کا تاج ملتا ہے اور وہ اسے اپنی گدڑی میں چھپا کر لاتا ہے اور بیت المال میں جمع کرا دیتا ہے اور لوگ پوچھتے ہیں کہ تمہارا کیا نام ہے تو کہتا ہے کہ ”میں اس لیے نہیں بتاتا کہ تم تعریف کرو گے۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور میں اس کے ثواب پر راضی ہوں۔“ یہ اسی ایمان کا ثمرہ ہے کہ جب نبیؐ خود ایک جاہل اعرابی کو مالِ غنیمت میں سے اس کا حصہ دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے: یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ میں اس لیے آپؐ کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ میں نے تو آپؐ کی رفاقت اس لیے اختیار کی تھی کہ اس جگہ (گلے کی طرف اشارہ

کر کے) تیر لگے تاکہ میں جنت میں جا سکوں۔" یہ اسی ایمان کا نتیجہ تھا کہ جب غزوۂ بدر کے موقع پر خدا کا پیغمبرؐ جہاد میں شرکت کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "بڑھو جنت کی طرف، جس کی وسعت زمین و آسمان ہیں۔" تو ایک شخص جو کھجور کے چند دانے کھا رہا تھا، ان کو پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے: "اگر ان کھجوروں کو کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا" اور میدان میں کود کر شہادت پاتا ہے۔ یہ اسی ایمان کا معجزہ ہے کہ جب امتناع شراب کا حکم آتا ہے تو اس سپردگی کے ساتھ اس کی اطاعت ہوتی ہے کہ جب کانوں تک خدا کا حکم پہنچتا ہے تو جو شراب پیالوں میں تھی وہ پھینک دی جاتی ہے اور جو قطرے ہونٹوں پر تھے وہ تھوک دیے جاتے ہیں اور مدینہ کی نالیوں میں شراب بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اسی ایمان کا اثر ہے کہ ایک ناخواندہ بھی جب اس کا اعلان کر دیتا ہے تو پھر فسق و فجور سے اس طرح بھاگتا ہے جس طرح روشنی سے تاریکی اور جب وہ خدا کے رسول سے بیعت کر کے اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے۔ راستے میں وہ عورت ملتی ہے، جس سے وہ دل لگی کیا کرتا تھا اور وہ اسے مل بیٹھنے کی دعوت دیتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے "اللہ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کا کوئی امکان نہیں۔"

تاریخ کی کھلی شہادت ہے کہ ایمان ہی سے دراصل وہ تبدیلی آتی ہے، جو انسان کی پوری زندگی کو بدل دیتی ہے اور اسے اجتماعی فلاح کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔ اور اسلامی آئیڈیولوجی کی دوسری بنیاد یہی حقیقت ہے۔

دین و دنیا کی وحدت

۳۔ اسلامی آئیڈیولوجی کی تیسری بنیاد دین و دنیا کی وحدت ہے اسلام نہ ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے اور نہ غلوفی الدنیا کی۔ وہ دین و دنیا کی تفریق کو ایک شیطانی نظریہ قرار دیتا ہے خواہ یہ دنیا کے نام پر پیش کیا جائے اور خواہ مذہب کے نام پر۔ نہ اسلام میں سیکولرزم کے لیے گنجایش ہے اور نہ رہبانیت کے لیے۔

مغربی فلسفہ کی ایک اساسی کمزوری یہ ہے کہ وہ روح اور مادہ کی تقسیم اور ان کے باہم تضاد پر قائم ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مذہب زندگی سے کٹ کر محض انفرادی عبادت میں محصور ہو گیا ہے اور پوری دنیا شیطان کی جولانیوں کا میدان بن گئی ہے۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ صوفی اور

نبی کے فرق کو بیان کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ نبی محض عرفان ذات کے لیے نہیں تعمیر حیات کے لیے آتا ہے۔ وہ حق تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے کے بعد مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ نور نبوت کے ذریعے زندگی کی تاریکیوں کو چھانٹتا ہے۔ خدا کی معراج کے بعد دنیا کی طرف لوٹتا ہے اور تاریخ کی رو کو بدلنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہی اسلامی آئیڈیولوجی کا نقطۂ نظر ہے۔ وہ زندگی کی نفی نہیں کرتی۔ اس کی صحیح بنیادوں پر تشکیل کرتی ہے اور حیات کے کسی شعبہ کو بھی دین کی رہنمائی سے آزاد نہیں کرتی۔ قرآن کا انسان سے مطالبہ ہے:

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ

(البقرۃ: ۲۰۸)

اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے اور شیطان کے راستوں کی پیروی نہ کرو۔

نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ پوری دنیا خدا کی مسجد ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پوری دنیا خدا کی مسجد ہے تو پھر دین سے باہر رہا کیا؟ خدا نے خود ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ہم آخرت اور دنیا دونوں کو سنواریں اور ان میں سے کسی کو بھی نظرانداز نہ کریں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (البقرۃ: ۲۰۱)

اے اللہ! تو عطا کر ہم کو دنیا میں جو ہمارے لیے بہترین ہے اور آخرت میں جو ہمارے لیے بہترین ہے۔

وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا (القصص: ۷۷)

اور تمہارا دنیا میں جو حصہ ہے اس کو نہ بھول جاؤ۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا:

اجملوا فی طلب الدنیا فانّ کلًّا میسّرٌ لما خلق لہ (ابن ماجہ)

دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو۔ اس لیے کہ جس لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ضرور اس کو ملے گا۔

اصلحوا دنیاکم واعملوا لاخرتکم کانکم تموتون غداً

(بحوالہ المدینہ والاسلام)

اپنی دنیا کو بہتر بناؤ اور آخرت کے لیے اس طرح کام کرو گویا تم کل ہی مر جاؤ گے۔

من سعیٰ علیٰ والدیہ فھو فی سبیل اللّٰہ۔ ومن سعیٰ علیٰ عیالہ فھو فی سبیل اللّٰہ ومن سعیٰ علیٰ نفسہٖ لیعفھا فھو فی سبیل اللّٰہ ومن سعیٰ علیٰ التکاثر فھو فی سبیل الشیطان (بیھقی طبرانی صغیر)

جو والدین کے لیے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے، جو اہل وعیال کے لیے محنت کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے۔ جو اپنی ذات کو فقر وفاقہ سے بچانے کے لیے کام کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو فخر ومباہات اور شان و شوکت دکھانے کے لیے محنت کرتا ہے: وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔

نعم المطیّة الدنیا فارتحلوھا فبلغکم الاٰخرة۔ (المدینة والاسلام)

بہترین سواری دنیا ہے، اس پر سوار ہو جاؤ اور اس پر قابو پالیا تو وہ تم کو آخرت تک پہنچا دے گی۔

آپؐ نے ہمیں یہ دعا سکھائی:

اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمة اَمری۔ واصلح لی دنیائی التی فیھا معاشی واصلح لی اٰخرتی التی فیھا معادی واحینی ماکانت الحیوٰة خیراً لی وتوفنی اذاکانت الوفاة خیراً لی وجعل الحیوٰة زیادہ لی فی کل خیرٍ واجعل الموت راحة لی من کل شرٍ (حصن حصین)

اے اللہ! تو میرے دین کو میرے لیے سدھار دے کہ وہ میرے ہر امر کا بچاؤ ہے۔ اور میرے لیے دنیا کو سدھار دے کہ اس میں میری معاش ہے۔ اور میرے لیے آخرت کو سدھار دے کہ اس طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے اور مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے اچھی ہے اور مجھے موت دے جب کہ موت میرے لیے اچھی ہو اور زندگی کو میرے لیے ہر نیکی میں اضافہ کا باعث بنا اور موت کو میرے لیے ہر برائی کے مقابلے میں موجب آرام بنا۔

مندرجہ بالا احادیث وآیات اسلامی آئیڈیولوجی کے مخصوص مزاج کو بڑی خوبی کے

ساتھ پیش کرتی ہیں۔ آئیڈیولوجی دنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنا چاہتی ہے اور خود، آخرت کی سنوار کا ذریعہ بھی دنیا کے سدھار ہی کو قرار دیتی ہے۔ اگر انسان اس دنیاوی زندگی کو صحیح طریقہ پر منظم کرتا ہے تو یہی آخرت میں کامیابی کا راستہ ہے۔ یہ دین کو دنیا کے تابع نہیں کرتی بلکہ دنیا کو دین کے تابع کرتی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

اجتماعی تحریک

۴۔ اسلامی آئیڈیولوجی محض ایک نظریہ ہی پیش نہیں کرتی ہے، بلکہ اس کو قائم کرنے، چلانے اور زمین پر وسعت دینے کے لیے ایک تحریک بھی برپا کرتی ہے۔ ''تحریک'' اس اجتماعی جدوجہد کا نام ہے جو کسی نصب العین کے حصول کے لیے منظم طور پر کی جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے ایک پیغام پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے جس کے آپ داعی تھے، مسلمانوں کو ایک اجتماعی زندگی میں منظم کیا۔ خود ان کی زندگیوں پر اس کو قائم کیا اور ان کو پوری دنیا کے سامنے اس دین کی شہادت دینے کے کام پر مامور کیا۔ مسلمانوں کی اس اجتماعی تنظیم اور اس جماعت بندی کا نام اسلامی تحریک ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

الاسلام احوج الیٰ الجماعة۔

اسلام میں جماعتی نظام نہایت ضروری ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے:

الجماعة رحمة والفرقة عذابٌ۔

جماعت رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

اسی طرح مشہور حدیث ہے:

''میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے۔ جماعت، سمع و

طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قاعدگی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

لوگوں نے عرض کیا: "کیا ایسا شخص جہنمی ہے اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔"

آپؐ نے فرمایا: "ہاں! اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔"

اس تحریک کا اصل کام خدا کے دین کو پھیلانا اور قائم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیا کو بھی یہی حکم دیتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ (المائدہ: ٦٧)

اے رسول! جو (دین) تم پر تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کی تبلیغ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرض رسالت کو ادا نہیں کیا۔

اور پوری امت مسلمہ کا مشن بھی یہی قرار دیا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ (آل عمران: ١١٠)

تم بہترین امت ہو، جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو۔ نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ (المائدۃ: ٨)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے حق کی شہادت دینے والے بنو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران: ١٠٣)

اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی آئیڈیولوجی اپنے قیام کے لیے ایک نظام بھی قائم کرتی ہے اور اس طرح ایک ایسی اجتماعی حیثیت قائم کرتی ہے، جو ایک طرف اس کے سماجی پروگرام کی تنفیذ کرے اور دوسری طرف پوری انسانیت کے سامنے اس کی دعوت کو پیش کرے۔ اسلامی تحریک ایک مشنری اور تعلیمی ادارہ ہے کسی بھی ریاست یا اجتماعی نظم کا یہ ادارہ قائم کرنا اصلاً معلّمی اور دعوت الی الحق کا فریضہ انجام دینا ہے۔

ثبات وتغیّر

۵- اسلامی آئیڈیولوجی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ثبات وتغیّر کے درمیان کامل توازن قائم کیا گیا ہے۔ امریکہ کے مشہور جج مسٹر کارڈوزا نے کہا تھا کہ "آج کی اہم ترین ضرورتوں میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفۂ قانون مرتب کیا جائے، جو ثبات و تغیر کے متحارب تقاضوں کے مابین توافق وتعاون پیدا کرے اور اس طرح قانون کے نشو وارتقاء کے لیے چند کارگر اصول فراہم کرنے کا موجب ہو۔" انسان نے آج تک بے شمار فلسفے وضع کیے ہیں، لیکن کوئی فلسفہ بھی ایسا نظام فکر وعمل پیش نہ کر سکا، جو ایسے اصول معاشرت پیش کرے جو دائمی اور ابدی ہوں اور دوسری طرف انسانی معاشرے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کو بھی پورا کرتے رہیں اور انسان کے لیے محض اپنی فکر اور اپنے تجربے کی بنا پر ایسے اصول پیش کرنا ہے، بھی ناممکن۔ زمان ومکان کی جو مجبوریاں انسان کو لاحق ہیں، ان کی بنا پر وہ اس کام کے لیے نا اہل ہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کے ابدی اصول پیش کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی سوسائٹی میں جو فطری تغیرات آتے ہیں ان سے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی فراہم کرتی ہے۔

قرآن وسنت کے دیے ہوئے اصول ابدی ہیں اور اگر پوری انسانیت متفقہ طور پر بھی ان میں کوئی تبدیلی کرنا چاہے تو اسے اس کا حق نہیں۔ یہ ہدایت خالق کائنات کی طرف سے ہے، انسانی فطرت کے مطابق ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (یونس: ٦٤)

خدا کی باتیں بدلتی نہیں یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ۭ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم: ۳۰)

خدا کی بنائی ہوئی چیز میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا ۝ (فاطر: ۴۳)

اور تم خدا کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی ابدی صداقت کی حامل ہے۔ اس میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا یہ کیسے ساتھ دے گی۔ اس کا جواب مختصراً یہ ہے:

(ا) اس آئیڈیولوجی میں وہ بنیادی اور اساسی اصول بیان کیے گئے ہیں، جو ہر زمانے کے لیے ہیں اور چوں کہ وہ اصول انسانی فطرت کے مطابق ہیں، اس لیے جب تک انسان کی فطرت نہیں بدلتی، ان اصولوں کی تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ اس زمین پر جو نظام حیات قائم ہے، اس کی کچھ بنیادیں ہیں اور تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کے باوجود حیاتِ انسانی کی بنیادی حقیقتیں ایک ہی ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی ہے۔ اب اس میں تغیر جو بھی ہوگا، وہ اس نئے نظام کے برپا ہوتے وقت ہوگا۔ جسے ہم آخرت کہتے ہیں۔ چوں کہ اسلام کے اصول اسی فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں، اس لیے ان میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

(ب) یہ اصول صرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قائم کرتے ہیں، جن پر زمان و مکان کے تغیر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ رہی وہ چیزیں، جن کا تعلق وقت موسم اور مقامی حالات وغیرہ پر ہے، ان سے یہ تعارض نہیں کرتے اور ہر زمانے کے لوگوں کو شریعت کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں تفصیلات طے کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام نے لباس میں ستر کا تعین کر دیا ہے، تشبہ بالکفار کی ممانعت کر دی ہے اور چند حدود مقرر کر دی ہیں۔ اب ان حدود

کی روشنی میں ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگ اپنا لباس اختیار کر سکتے ہیں۔ اسلامی آئیڈیولوجی کوئی ایک لباس تجویز نہیں کرتی۔ اسی طرح معاشرت، معیشت اور سیاست میں بنیادی اصول اور اساسی ادارے قائم کرنے کے بعد شریعت مسلمانوں کو آزاد چھوڑتی ہے کہ پیش آمدہ معاملات کو اسلام کی مجموعی ہدایت کی روشنی میں اور ان حدود کو قائم رکھتے ہوئے جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر کی ہیں، اپنے اجتہاد سے حل کریں۔ اس طرح ثبات کے ساتھ ساتھ تغیر کے تقاضوں کو پورا کرنے کا بھی انتظام کر دیا گیا اور زندگی کے تسلسل کو بھی متاثر نہیں ہونے دیا گیا۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہو کہ اسلام نے بنیادی اصول مقرر کرنے کے بعد خود تغیر کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے بھی ایک اصول، اصولِ اجتہاد و اجماع (ایک نئے مسائل کو حل کرنے کی راہ کھولتا ہے اور دوسرا ماضی کے فیصلوں کو محفوظ کرنے کا بندوبست کرتا ہے تاکہ روایت منقطع نہ ہونے پائے) بھی وضع کر دیا تاکہ اس ابدی اصول کے ذریعے نئے معاملات کو طے کیا جا سکے۔

(ج) اسلامی آئیڈیولوجی کی اصل دل چسپی انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی ہے۔ قرآن انسان کی ہدایت کے لیے آیا ہے، سائنس یا جغرافیہ کے مسائل بیان کرنے کے لیے نہیں۔ اسی لیے اسلامی آئیڈیولوجی علوم طبیعی کے مسائل سے تعرض نہیں کرتی ہے اور انہیں انسان کے تجربہ اور مشاہدہ پر چھوڑ دیتی ہے۔ اس بات کو شاہ ولی اللہؒ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"من جملہ سیرت انبیاء کرام علیہم السلام کے ایک یہ ہے کہ جن باتوں کا تعلق نفیاً یا اثباتاً تہذیب نفس اور تزکیۂ روح یا سیاست امت کے ساتھ نہیں، ان میں وہ خوض نہیں کرتے۔ مثلاً کائنات الجو (وہ مناظر جو فضا میں نظر آتے ہیں مثلاً بجلی کا کوندنا، بادل اور بارش، برف، طوفان، شہابوں کی حرکت وغیرہ) کے ظہور میں آنے کے اسباب و علل، کسوف اور خسوف کی حقیقت یا بالفاظ دیگر نظام شمسی کی کیفیت، نباتات اور حیوانات کے انواع و اقسام اور ان کے وہ خصائص وغیرہ جن کا جاننا ترقی تمدن کا باعث ہے۔" (حجۃ اللہ البالغۃ، جلد اول، ترجمہ مولانا عبدالرحیم صاحب)

اس بحث سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی انسانی زندگی کے ان مسائل سے تعرض کرتی ہے، جو ہدایت و ضلالت سے متعلق ہیں اور ہدایت و ضلالت کا قانون

ابدی ہے۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو زمانے کے طبعی علوم سے متعلق ہوں، تو ان کے متعلق اس کا اپروچ یہ ہے کہ وہ انسان کو تفکر و تعقل اور جد و جہد کی دعوت تو دیتی ہے، لیکن مسائل کو اس کی اپنی عقل پر چھوڑ دیتی ہے۔ اسے ان کے نفی یا اثبات سے زیادہ غرض نہیں اور کسی چیز کا ذکر بھی کرتی ہے تو بطور تذکیر کے، نہ کہ کسی طبعی اصول کو بیان کرنے کے لیے۔ قرآن میں جن چیزوں کا ذکر بحیثیت حقائق کے ہے ان میں سے کسی کے ذرہ برابر بھی غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں اور آج تک کا سارا علمی سرمایہ اس پر شاہد ہے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام علم طبیعیات، علم کیمیا، علم نباتات، علم حیوانات، علم الارض وغیرہ کے نظریات پیش نہیں کرتا۔ وہ انسان کی ہدایت کا آئین پیش کرتا ہے اور ان تمام علوم میں ترقی کرنے اور ان کی معلومات سے استفادہ کرنے کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔

اسلامی آئیڈیولوجی کے اس اپروچ نے مذہب اور سائنس کے درمیان اس قسم کے تصادم کے امکانات ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے ہیں جو یورپ میں رونما ہوا تھا۔ ان علوم میں تغیر و تبدل کے پورے امکانات موجود ہیں اور اسلام نے ان میں ارتقاء کے مواقع فراہم کر دیے ہیں اور کوئی پابندی ان پر نہیں لگائی۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ثبات و تغیر کے تقاضوں کو کس خوب صورتی سے ملحوظ رکھا گیا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اصول ہر زمانے کے لیے راہ نما نہیں ہو سکتے اور اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت ہے، وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ اصول کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں ہیں کہ ان پر زمان و مکان کا اثر پڑے۔ یہ اس خدا کے بنائے ہوئے ہیں، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ان اصولوں کا ہی خالق نہیں، انسان، زمین و آسمان، فطرت اور خود زمان و مکان کا بھی خالق ہے۔ "ماضی" "حال" اور "مستقبل" کی اصطلاحات فانی انسانوں کے لیے ہیں۔ اس خدا کے لیے نہیں جو لافانی ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور کائنات کی ہر شے، جس کی قدرت کے تابع ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

(الحدید:۳)

جو اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور باطن بھی اور وہ تمام چیزوں کا جاننے والا ہے۔

تدریج

٦- اس سلسلے کی آخری چیز یہ ہے کہ اسلامی آئیڈیولوجی کا طریقہ کار غیر حقیقت پسندانہ نہیں ہے، وہ ہر کام کو مناسب اور معقول طریقے سے انجام دینا چاہتی ہے۔ وہ خدا کی ابدی ہدایت کو حرف بہ حرف قائم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن چوں کہ اس کا اصل مقصد انسانوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا نہیں ان کے لیے آسانیاں فراہم کرنا ہے، اس لیے وہ ایک مناسب تدریج کے ساتھ اپنے پورے لائحہ عمل کی تنفیذ کرتی ہے۔ نبی کا اصل کام لوگوں کو ان مشکلات اور مصائب سے نکالنا ہے، جن میں وہ خود اتباع نفس یا ترک دنیا کی وجہ سے گرفتار ہو گئے ہیں۔ دین کے اوامر و نواہی کا یہی مقصد ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ

(اعراف:۱۵۷)

محمد رسول اللہ ﷺ ان کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرتے ہیں بری چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں۔ اس کے بوجھ سے نجات دلاتے ہیں، جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں اور ان پھندوں سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں۔

پھر اسلام انسان پر اس بوجھ سے زیادہ بوجھ بھی نہیں ڈالتا، جس کا وہ متحمل نہ ہو سکے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (بقرۃ:۲۸۶)

اللہ کسی کو اس کی گنجائش سے بڑھ کر مجبور نہیں کرتا۔

دین کا مقصود آسانی پیدا کرنا ہے، بے جا مشکلات بڑھانا نہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ (الحج:۷۸)

تم پر اللہ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ○

(النساء:۲۸)

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے بار کو ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرة:۱۸۵)

اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے، تم پر دشواری نہیں چاہتا۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا:

بعثت بالحنيفية السمحة ان هٰذا الدين يسر.

مجھے نہایت سیدھے سادھے آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا بیشک یہ دین آسان ہے۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''اگر مجھے اپنی امت کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا فرض قرار دیتا۔'' جس سے معلوم ہوا کہ دین میں آسانی کو بھی ایک قدر کی حیثیت حاصل ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا گیا۔

پھر ہم اسلامی انقلاب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نماز، زکوٰۃ، حرمتِ شراب، حرمتِ سود وغیرہ بے شمار احکام کی تنفیذ میں تدریج کا اہتمام فرمایا تاکہ اس کے بندے اس کے احکام کی اطاعت کے خوگر ہو سکیں اور آہستہ آہستہ اس نظام عدل کو پوری طرح اپنے اوپر نافذ کرلیں جو ان کے رب نے ان کی طرف نازل کیا ہے۔

اسلامی آئیڈیولوجی کے نفاذ میں بھی ہر دور میں اسی تدریج کا خیال رکھا جائے گا۔ جو قرنِ اول میں رکھا گیا تھا۔ تدریج اس آئیڈیولوجی کا ایک مستقل اصول ہے۔ اور اس کے ذریعے اس کا نفاذ زیادہ مکمل اور دیرپا ہو سکے گا۔

لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ تدریج کوئی من مانی چیز نہیں ہے۔ خود شریعت ہی نے اس تدریج کے اصول اور ضابطے بھی ہم کو بتادیے ہیں اور انہیں اصولوں اور ضابطوں کے مطابق شریعت کی تنفیذ ہر زمانے میں عمل میں آئے گی۔ اور تدریج پر عمل پورے خوفِ خدا، احساسِ آخرت اور حقیقی اتباع کے جذبے ہی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ ایک ایسا نازک میدان ہے کہ اس میں ذرا سی غلطی بڑے دوررس نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ نیز تدریج کے اصول انھی لوگوں کے لیے ہیں جو فی الحقیقت خدا کے قانون کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نہیں جو تدریج کے نام پر اطاعت کا ہر قلادہ گردن سے اتار دینا چاہتے ہیں۔ قانون اطاعت کرنے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ توڑنے والوں کے لیے نہیں۔

اگر ان باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو تدریج کا اصول اسلام کے ان عظیم احسانات میں سے ہے، جن پر عالم انسانیت بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

(۳)

اسلامی آئیڈیولوجی اور فرد

اسلامی آئیڈیولوجی فرد اور سماج دونوں کی اصلاح و تربیت کو یکساں اہمیت دیتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ جدید مغربی تحریکات کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ محض خارج میں تبدیلی کر کے نظامِ زندگی میں انقلاب لانا چاہتی ہے۔ انہوں نے فرد کو نظر انداز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اصلاحی پروگرام کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس مشرق کے مذہبی نظاموں نے صرف فرد کی اصلاح اور اس کی روح کو جلا بخشنے کے پروگرام بنائے، لیکن اجتماعی زندگی کی درستی سے بالکل صرفِ نظر کیا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ نظام بھی ناکام رہے۔ اسلامی آئیڈیولوجی کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فرد اور سماج دونوں کی تطہیر اور ترقی کا پروگرام پیش کرتی ہے۔ ہر فرد کی صلاحیتوں کو خود اس کی اپنی اصلاح اور اجتماعی نظام کی تشکیلِ جدید کے لیے صرف کرتی ہے۔

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہے۔ وہ انسان کو محض نظامِ اجتماعی کا ایک بے جان پرزہ یا ماحول کا ایک پرتو نہیں سمجھتا۔ بلکہ اسے اصل تاریخ ساز، قرار دیتا ہے۔ اس میں انفرادی ذمے داری کا احساس بیدار کرتا ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے اہم خطوط متعین کرتا ہے۔ فرد کی اصلاح کے لیے اسلام کا جو پروگرام ہے، اس کی چند نمایاں چیزیں یہ ہیں:

انفرادی ذمّے داری

اسلامی آئیڈیولوجی سب سے پہلے ہر فرد میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتی ہے کہ وہ اپنے اعمال کا ذمے دار اور اپنی پوری زندگی کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ خدا کے سامنے ہر

فرد کی ذمہ داری انفرادی ہے اور اس طرح خود معاشرے میں بھی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشوو ارتقاء کا پورا پورا موقع ہونا چاہیے۔ قرآن انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سب سے پہلے خود اپنی اصلاح کی کوشش کرے۔ کوئی دوسری نیکی اپنی ذات کی اصلاح کو نظر انداز کرنے کا بدل نہیں ہو سکتی۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۴۴)

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو مگر خود اپنی خبر نہیں لیتے؟ حالاں کہ خدا کی کتاب برابر تلاوت کرتے ہو (افسوس) کیا اتنی موٹی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟

پھر انفرادی ذمہ داری کے اصول کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ (حٰم سجدہ: ۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا۔ اور جس کسی نے برائی کی تو خود اس کے آگے آئے گی۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (الانعام: ۱۶۴)

اور کوئی جان نہیں کماتی مگر اس کا وبال اسی پر ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

حضور اکرمؐ نے اس اصول کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

الا لایجنی جان الاعلیٰ نفسہٖ

ہاں! مجرم اپنے جرم کا آپ ذمے دار ہے۔

پھر ہر فرد کو اس کام اور اس منصب کے فرائض کے سلسلے میں ذمے دار قرار دیا، جو اس کے سپرد ہو اور اس طرح انسان کی زندگی کو ذمّے داری کی زندگی بنا دیا۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ (بخاری)

تم میں سے سب گلہ بان ہیں اور ہر ایک گلہ بان سے اس کے گلے کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

قرآن و حدیث کی انھی تعلیمات کی بجا آوری کے لیے اسلامی آئیڈیولوجی سب سے پہلے فرد میں احساس ذمے داری کو بیدار کرتی ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات نقش کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ اسے اپنے ہر ہر عمل کی انفرادی طور پر جواب دہی کرنی ہوگی۔

ایمان اور علم دین

۲- فرد کی اصلاح کے لیے دوسری ضرورت اس امر کی ہے کہ خدا، رسول اور آخرت پر برابر تازہ کیا جاتا رہے اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ایمان کے نقش گہرے تر ہوتے جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے علم دین کی فراہمی سب سے اہم ہے۔ اسلام حصول علم کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ دین کا اتنا علم کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی مطالبات کیا ہیں فرضِ عین کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر علم دین کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔

قرآن علم کو خدا کا فضل قرار دیتا ہے اور انسان کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ اضافۂ علم کی دعا مانگا کرے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ (النساء: ۱۱۳)

(اور اے پیغمبر) ہم نے تم کو ان سب چیزوں کی تعلیم دی جن کو تم نہ جانتے تھے اور خدا کا فضل آپ پر عظیم ہے۔

وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ: ۱۱۴)

اور آپ دعا کیجیے: پروردگار! میرا علم اور زیادہ کر۔

اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلمٍ۔

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

آپؐ نے مزید فرمایا:

"علم سیکھو" اس لیے کہ وہ حلال وحرام میں تمیز سکھاتا ہے اور اہل جنت کا راستہ بتاتا ہے۔ وہ وحشت میں انس ومحبت پیدا کرتا ہے، تنہائی کا ساتھی ہے، عسرت وتنگ دستی میں راہ نما ہے۔ دشمنوں کے مقابلے میں بہترین ہتھیار ہے۔ دوستوں کا نایاب ساتھی ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قوموں کو عروج عطا فرماتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ نیکوں کے قائد وراہ نما اور امام بن جاتے ہیں۔ اور ان کے اعمال وافعال کی پیروی کی جاتی ہے اور ان کی رایوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔" (جامع بیان العلم)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی آئیڈیولوجی علم کے فروغ (خصوصیت سے علم دین) کو ایک بڑا اور اونچا مقام دیتی ہے اور جب تک ہر فرد کو اس کے دین سے اچھی طرح آگاہ نہیں کر دیتی وہ اپنی بنیادی ذمے داری سے عہدہ برا نہیں ہوتی۔ یہ وہ چیز ہے، جس پر فرد کے ایمان کے استحکام کا اور عملی زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے۔ اس لیے اسلامی آئیڈیولوجی کا کوئی پروگرام اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

جذبۂ عمل اور عملِ صالح

۳۔ علم دین کا اصل مقصد عملی زندگی کی اصلاح ہے۔ اس لیے اسلام ہر فرد میں جذبۂ عمل بیدار کرتا ہے۔ اور سعی وجہد کی اہمیت اس کے ذہن پر مرتسم کرتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰیۙ وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰیۙ
(النجم: ۴۰،۳۹)

یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جاتی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ
(النساء: ۳۲)

مردوں کے لیے وہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے وہ ہے جو وہ کمائیں۔

نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے:

من جد وجد ولکل مجتهد نصیب۔ (المدینة والاسلام)

جو شخص کوشش کرے گا اس کو اس کی کوشش کا پھل ملے گا اور ہر کوشش کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔

اسعوا فان اللہ کتب علیکم السعی۔ (مسند امام احمد)

کوشش کرو، کیوں کہ اللہ نے تم پر کوشش کرنی فرض کی ہے۔

جذبۂ عمل کو بیدار کر کے اسلام فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اچھے اعمال کرے۔ ایمان جس کے نتیجے میں اچھے اعمال رونما نہ ہوں، اس بیج کی طرح ہے جو بار آور نہ ہو سکے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

الایمان معرفة بالقلب واقرار باللسان وعمل بالارکان
(کنوز الحقائق)

ایمان، دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کا نام ہے۔

لایقبل اللہ ایماناً بلاعملٍ ولا عملاً بلا ایمانٍ (ایضاً) **ان من اکمل الایمان حسن الخلق۔** (ایضاً)

اللہ ایمان کو بغیر عمل قبول نہیں کرتا اور عمل کو بغیر ایمان قبول نہیں کرتا عمدہ اخلاق کمال ایمان ہے۔

عمل صالح کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرنے کے بعد اسلام ان اچھی صفات کی پوری تفصیل بھی بیان کرتا ہے، جن سے انسان کو متصف ہونا چاہیے اور ان برائیوں کی نشان دہی کرتا ہے جن سے اسے بچنا ہے:

اسلامی آئیڈیولوجی اس امر کی پوری کوشش کرتی ہے کہ وہ انسان کو عملِ صالح کی ترغیب دے اور اس طرح ہر فرد کو خیر کا چلتا پھرتا نمونہ بنائے۔ اس لیے کہ دنیا وآخرت کی کامیابی کا انحصار عمل صالح پر ہی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے

کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا — جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔

عبادات

۴- فرد کی اصلاح کا ایک موثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت ہے کہ قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ

(الحج: ٤١)

مسلمان وہ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار عطا کیا جاتا ہے تو وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

اسلام نے عبادات کا ایک مفصل پروگرام دیا ہے، جس میں نہ کسی اضافے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کمی کی گنجایش۔ اس نظامِ عبادت کو قائم کرنا اسلامی آئیڈیولوجی کا اولین مقصد ہے۔

افراط وتفریط سے بچنا

۵- اسلامی آئیڈیولوجی فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ افراط وتفریط سے بچے۔ نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جائے اور نہ صرف مذہب کا **غلو فی الدّین** اور **غلو فی الدّنیا** دونوں سے روکا گیا ہے۔ اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے:

خَیْرُ الامور اوسطها.

ہر ایک کام میں اوسط درجہ بہت ہی اچھا ہے۔

ایک صحابی عثمان بن مظعونؓ عبادت میں غلو سے کام لیتے تھے۔ آپؐ نے کہلا بھیجا کہ ''تم میری سنت سے اعراض کرتے ہو'' انہوں نے جواب دیا: ''خدا کی قسم یا رسول اللہؐ! ہرگز نہیں بلکہ میں تو آپؐ کی سنّت کا طالب ہوں۔''

تو آپؐ نے فرمایا:

''میں تو سوتا بھی ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس عثمان! اللہ سے ڈرو۔ تمہارے اہل وعیال کا تم پر حق ہے،

اور تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے، اور تمہارے نفس کا تم پر حق ہے۔ روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھا کرو، سویا بھی کرو۔'' (ابوداؤد)

ایک اور حدیث ہے:

اعمل لدنیاکَ کانک تعیش ابداً واعمل لاٰخرت کانک تموت غداً۔

(المدینہ والاسلام)

دنیا کے کاموں میں ایسی کوشش کرو کہ گویا تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کے لیے اس طرح عمل کرو گویا تم کل ہی مر جاؤ گے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا○

(الفرقان: ٦٧)

وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے لیکن کنجوسی بھی نہیں کرتے ان کی روش دونوں حالتوں کے بین بین اعتدال پر رہتی ہے۔

اسلامی آئیڈیولوجی ہر فرد میں اعتدال کی روش اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور اسے اوسط درجے کی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس لیے کہ میانہ روی صفاتِ نبوت میں سے ایک ہے۔

تحریک قامتِ دین

٦- اسلامی آئیڈیولوجی کا یہ بھی ایک جزو ہے کہ وہ ہر فرد میں اقامتِ دین کی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرے۔ تاکہ ہر فرد اسلام کا سپاہی اور اس کا سفیر بن جائے، اس جدوجہد کی وجہ سے ایک طرف ہر فرد باطل کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی وجہ سے خود اپنے آپ کو برے اثرات، خرابی ... رطاغوت کی اثر اندازیوں سے محفوظ رکھ سکے گا اور دوسری طرف ... کے نتیجے میں ... توں کو استحکام وترقی حاصل ہوگی اور بالآخر اسلام خدا کی ساری زمین پر غالب ... ہوگا۔

اسلام مسلمانوں کو'' ... وسط'' قرار دیتا ہے اور اس امت کی تخلیق کا مقصد ہی یہ قرار

دیتا ہے کہ وہ انسانیت کی مصلح ہے۔ نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے تاکہ خدا کی زمین خدا کے دین کے لیے خالص ہو جائے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (آل عمران:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو۔ نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی طرح امت کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ (الانفال:۳۹)

اور جہاد کرو حتیٰ کہ فتنہ کا قلع قمع ہو جائے اور پورا دین خدا کے لیے خالص ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ (المائدہ:۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے حق کی شہادت دینے والے بنو۔

امت کی اسی حیثیت کی بنا پر ہر فرد کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں شرکت کرے اور اپنی زندگی کا اصل مقصد دنیا کمانے کو نہیں بلکہ دین قائم کرنے کو قرار دے اور اس راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پڑے اسے پیش کرنے میں دریغ نہ کرے۔

انْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ

(التوبۃ:۴۱)

ایمان والو! دین کی دعوت اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے لیے گھروں سے نکلو اور چل پڑو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری اور اللہ کے راستے میں جان اور مال سے کوشش کرو۔

اسلامی آئیڈیولوجی فرد کی اصلاح کے لیے جو پروگرام پیش کرتی ہے، اس میں مندرجہ بالا ذیلی نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

(۴)

معاشرتی نظریہ

انفرادی اصلاح کے ساتھ اسلامی آئیڈیولوجی اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھی واضح ہدایات اور ایک سوچا سمجھا منصوبہ پیش کرتی ہے۔ اس سلسلے میں چند بنیادی اصول ہیں۔ جن پر اسلام اپنے معاشرتی پروگرام کو مرتب کرتا ہے اور پھر چند اساسی ادارے ہیں، جن کے ذریعے وہ اس پروگرام کی تنفیذ کرتا ہے۔

معاشرتی نظریے کی بنیادیں

اسلام کے معاشرتی نظریے کی بنیادیں یہ ہیں:

۱- تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے اور یہ رشتہ اتنا قوی ہے کہ اسے دوسرے تمام تعصبات اور عصبیتوں کو مغلوب کر لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات:۱۰)

وہ لوگ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، بھائی بھائی ہیں۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ۠ (آل عمران:۱۰۳)

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"ایک مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کے مانند ہے ایک جزو دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے۔" (بخاری)

مزید فرمایا:

"تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ بدن میں ایک عضو مریض ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔"

اُخوۃ بین المسلمین اسلام کے معاشرتی نظریے کی پہلی بنیاد ہے۔

۲- تمام انسان خدا کی مخلوق ہیں، رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، برادری، ملک اور قوم کی کوئی تفریق ایسی نہیں ہے، جو انسانوں میں اونچ نیچ قائم کرے۔ ایسے تمام تصوّرات جاہلی تصورات ہیں اور اسلام مساواتِ انسانی اور وحدتِ انسانی کی بنیاد پر اپنے تمام معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے۔ پوری انسانیت آدم کی اولاد ہے۔ اور سب ایک خدا کے قانون کے تابع ہیں۔ توحید صرف نظامِ کائنات میں وحدت اور ایک خدا ہی کا تصوّر پیش نہیں کرتی بلکہ وحدتِ انسانی کا تصور بھی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کرسکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو اور اللہ خوب جانتا اور خبردار ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (النسآء:۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو وہ پروردگار جس نے تمہیں اکیلی جان سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا۔ پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔ پس دیکھو اللہ سے ڈرو۔

حدیث میں آتا ہے:

الخلق كلهم عيال الله فاحبّهم الى الله انفعهم لعياله. (جامع صغير)

تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبہ کے حق میں مفید ہو۔

يايها النّاس الا ان ربكم واحد وان اباكم واحد الا لاَ فضل لعربى على العجمى ولا للعجمى علىٰ عربى ولا لاحمر علىٰ اسود ولا لِاَسود علىٰ احمر اِلاّ بالتقوىٰ. (مسند احمد)

اے لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے ہاں! کوئی فضیلت نہیں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر۔ سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اس طرح وحدتِ انسانی اور معاشرتی مساوات اسلام کے معاشرتی نظریے کی دوسری بنیاد ہیں۔

۳- عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں ـ دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے معمار ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے اور دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق ہیں۔ عورت اور مرد کا عام رشتہ بھائی اور بہن کا ہے اور وہ ایک دوسرے کے لیے اس طرح حرام ہیں، جس طرح سگے بھائی بہن۔ نکاح وہ طریقہ ہے، جس سے یہ ایک دوسرے کے شریکِ زندگی ہوتے ہیں اور یہی وہ جائز اور صحت مند رشتہ ہے، جس کے ذریعے یہ ایک دوسرے کے لیے حلال ہو سکتے ہیں۔ اس رشتے سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے اور خاندان کے نظام میں دونوں کو ایک دوسرے پر حقوق حاصل ہیں۔ لیکن شوہر خاندان کا قوام ہے اور اس حیثیت سے اسے ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ (الاعراف:۱۸۹)

وہی ہے جس نے اکیلی جان سے تمہیں پیدا کیا اور اس سے جوڑا بنا دیا۔ تاکہ وہ اس کی رفاقت میں چین پائے۔

ان لکم علیٰ نساء کم حقا و لمن علیک حقاً۔ (طبری)

(حضورؐ نے فرمایا) تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء: ۳۴)

مرد عورتوں کے لیے قوام ہے۔

۴- معاشرے کی عام فضا خیر خواہی، تعاون، اشتراک عمل اور بھائی چارہ کی ہونی چاہیے۔ لوگ جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی بھیجیں۔ ہر شخص اپنے بھائی کے لیے وہی چاہے، جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ غیبت، چغل خوری، کینہ پروری، سوءِ ظن اور بے جا حرف گیری سے سب پرہیز کریں۔ نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور برائیوں سے ایک دوسرے کو روکیں۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ: ۲)

بھلائی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر ہرگز کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ (القصص: ۷۷)

اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد کا خواہش مند نہ بن۔ اللہ تعالیٰ مفسدوں کو پسند نہیں فرماتا۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ (حم سجدہ: ۳۴)

اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی۔ آپ نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال دیا کیجیے پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا۔ جیسا کہ ولی دوست ہوتا ہے۔

الدّین النّصیحة (حدیث)

دین خیر خواہی کا نام ہے۔

حضور اکرمؐ نے یہ دعا مانگی اور مسلمانوں کو اس کی تعلیم کی کہ:

اللّٰھم اِنی اعوذبک من ان اظلم او اظلم او اعتدی او یعتدی علیّ او اکتسب خطیئة او ذنبا لاتغفرہ۔

(حصن حصین)

اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں دوسروں کو مضرت پہنچانے سے اور اس مضرت سے جو دوسرے مجھے پہنچائیں اور خود حدودِ معینہ سے تجاوز کرنے سے اور دوسروں کے حدودِ معینہ سے تجاوز کرنے سے یا ایسی خطا کاری سے، جس کو تو معاف کرنا نہ چاہے۔

اس طرح اسلام معاشرے کی عام فضا کو حسنات سے بھر دینا چاہتا ہے۔

۵- اسلامی آئیڈیولوجی ہر فرد میں اجتماعی ذمّے داری کا تصوّر پیدا کرتی ہے اور پورے معاشرے میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ نیکیوں کو قائم کرنے والا، برائیوں کو روکنے والا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہے۔ ایسی انفرادیت کے لیے جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمّے داری کے تصوّر سے نا آشنا بھی ہو۔ اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے:

وہ مسلمان جو لوگوں میں گھل مل کر رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا رہے اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے گھل مل کر نہ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔ (ترمذی)

"تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیّت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس امام حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیّت کے بارے میں دریافت کیا

جائے گا اور ہر شخص اپنے اہل وعیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیّت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیّت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیّت کے متعلق بازپُرس ہوگی۔" (متفق علیہ)

قرآن پاک کا ارشاد ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (الذٰریٰت:۱۹)

اور ان کے اموال واملاک میں سائل اور مفلس افراد کا بھی حق (حصّہ) ہے۔

یہ آیت اور مندرجہ بالا احادیث اجتماعی ذمّے داری کے تصوّر کو پیش کرتی ہے اور اسلامی آئیڈیولوجی پورے معاشرے میں یہی جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے۔

۶۔ ان عمومی ہدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے باہم حقوق وفرائض کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے۔ جس پر بھائی کے حقوق، اہلِ خانہ کے حقوق، رشتے داروں کے حقوق، اہلِ محلّہ کے حقوق، غیر مسلموں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے حقوق تک کو متعیّن کردیا ہے۔ تاکہ انسان محض جذبات کی رو میں بہہ کر نا انصافی کا مرتکب نہ ہو۔ اور معاشرہ صحت مند بنیادوں پر قائم رہے اور برابر ارتقا کرتا رہے۔

معاشرتی ادارے

مذکورہ بالا معاشرتی اصولوں کو بروئے کار لانے کے لیے اسلام نے کچھ مستقل ادارے بھی قائم کیے ہیں، ان میں اہم ترین یہ ہیں:

(ا) خاندان۔ اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کے نظام کو بڑی بنیادی اہمیّت حاصل ہے۔ یہ ادارہ وہ تربیت گاہ ہے، جہاں سے اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور اخلاقِ حسنہ کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ہی سے بچے میں اسلامی اقدار کا احترام پیدا ہو اور اس کی سیرت اسلامی سانچوں میں ڈھل جائے۔

(ب) قرابت۔ خون کے رشتوں کو اسلام نے قائم رکھا ہے اور وراثت کے قانون کے ذریعے انہیں ایک مستقل مقام دے کر صحت مند اور فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے۔

(ج) محلہ۔ اسلام کی تعلیمات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر محلّے کو معاشرے کا ایک یونٹ مانتا ہے۔ بلکہ اگر جسارت نہ ہو تو ہم یہاں تک کہیں گے کہ چھوٹے پیمانے پر اجتماعی زندگی کی تنظیم بندی اسلام کی روح سے زیادہ قریب ہے۔ جو حقوق ایک عام مسلمان کے دوسرے پر اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ اور جو مقام ہمسایے کو دیا گیا ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اجتماعی تنظیم ایسے اسلوب میں ہو، جس میں لوگوں کو ایک دوسرے کو جاننے اور باہم رنج وخوشی میں شریک ہونے کا پورا پورا موقع ملے، یہ اسی وقت ممکن ہے، جب معاشرتی تنظیم کا یونٹ مختصر رہے۔

(د) مسجد۔ معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے۔ اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ہی کے ذریعے کامیاب ہوسکتا ہے اس میں مساجد کی صحیح تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

(ہ) معاشرہ۔ عام معاشرے کو بھی اسلام ایک مستقل ادارہ قرار دیتا ہے اور باہم حقوق وفرائض کا ایک ایسا نظام مرتّب کرتا ہے کہ تمام لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ جاتے ہیں۔

(و) احترام روایات۔ مسلم معاشرے کی روایات صحیحہ (عرف) کا احترام اور ان کا استحکام بھی معاشرتی پالیسی کا ایک جزو ہے اور اس کے ذریعے مسلم معاشرہ کبھی بھی اپنے ماضی سے کٹ نہیں جاتا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کی بنا پر تبدیلی ضرور ہوتی ہے، لیکن یہ تبدیلی مستقل اور خاموش ارتقا کے ذریعے ہوتی ہے۔ کسی شعوری اور غیر معمولی بغاوت یا ماضی سے انقطاع کے ذریعہ نہیں۔

(ز) نظام تعلیم۔ معاشرہ کے سدھار، اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے نظامِ زندگی کو نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے کے لیے اسلامی آئیڈیولوجی نظام تعلیم کو بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ اس پر بے شمار آیات، احادیث، اور آثار اور حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کا طریقہ دلالت کرتا ہے۔ آج بھی کُلّی اصلاح اس ادارے کی اصلاح کے بغیر ناممکن ہے۔

(ک) ''نظام'' حدود وتعزیرات۔ معاشرے کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد اسلامی آئیڈیولوجی حدود وتعزیرات کا ایک نظام بھی عطا کرتی ہے۔ جن کے ذریعے معاشرہ کو ان افراد سے محفوظ کیا جاتا ہے جو تعلیمی اور ترغیبی ذرائع سے اصلاح نہ پکڑیں اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ ان حضرات کو اسلام قرار واقعی سزا دیتا ہے تا کہ معاشرہ ان کی دست درازیوں سے محفوظ رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہونے پائے۔

(۵)

معاشی پروگرام

اسلامی آئیڈیولوجی ایک معاشی پالیسی بھی پیش کرتی ہے۔ اس کے درج ذیل اصول ہیں:

۱- سب سے پہلے وہ فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریے کو ختم کرتی ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں۔ قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الجمعہ: ۹، ۱۰)

مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے؛ تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

قرآن میں بے شمار مقامات پر معاش کو ''فضل اللہ'' کہا گیا ہے۔ اس سے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے اور معاشی زندگی کو بھی انسان کو اس طرح خدا کی حدود کا پابند بنانا چاہیے، جس طرح باقی تمام زندگی کو۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور: ۳۷)

وہ لوگ جنہیں خرید وفروخت اور تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

باب چہارم :

اسلام اور جاہلیت

(1) جاہلیت کا مفہوم

(2) خالص جاہلیت

(3) رہبانیت

(4) شرک کی حقیقت

(5) اسلام : ذریعۂ نجات

(6) انبیائے کرامؑ کی دعوت اور مشن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور جاہلیت

(یہ مقالہ ۲۳ فروری ۱۹۴۱ کو مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر پڑھا گیا تھا)

انسان کو دنیا میں جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی معاملہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس چیز کی ماہیّت و کیفیت اور اپنے اور اس کے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے بجائے خود صحیح ہو یا غلط، مگر بہر حال اسے ان امور کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اور جب تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کر لیتا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میں اس کے ساتھ کیا طرزِ عمل اور کیا رویّہ اختیار کروں۔ یہ آپ کا شب و روز کا تجربہ ہے۔ آپ جب کسی شخص سے ملتے ہیں تو آپ کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ شخص کون ہے، کس حیثیت، کس مرتبے، کن صفات کا آدمی ہے اور مجھ سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اس کے بغیر آپ یہ طے کر ہی نہیں سکتے کہ آپ کو اُس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوتا تو بہر حال آپ کو قرائن کی بنا پر ایک قیاسی رائے ہی ان امور کے متعلق قائم کرنی پڑتی ہے اور جو رویّہ بھی آپ اس کے ساتھ اختیار کرتے ہیں اسی رائے کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کھاتے ہیں ان کے ساتھ آپ کا یہ معاملہ اسی وجہ سے ہے کہ آپ کے علم یا آپ کے قیاس میں وہ چیزیں غذائی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ جن چیزوں کو

آپ پھینک دیتے ہیں، جن کو آپ استعمال کرتے ہیں، جن کی آپ حفاظت کرتے ہیں، جن کی آپ تعظیم یا تحقیر کرتے ہیں، جن سے آپ ڈرتے یا محبت کرتے ہیں، اُن سب کے متعلق آپ کے یہ مختلف طرزِ عمل بھی اُس رائے پر مبنی ہوتے ہیں جو آپ نے اُن چیزوں کی ذات وصفات اور اپنے ساتھ اُن کے تعلق کے بارے میں قائم کی ہے۔

پھر جو رائے آپ اشیاء کے متعلق قائم کیا کرتے ہیں اُس کے صحیح ہونے پر آپ کے رویّہ کا صحیح ہونا اور غلط ہونے پر آپ کے رویّہ کا غلط ہونا منحصر ہوتا ہے۔ اور خود اُس رائے کی غلطی و صحت کا مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ آیا آپ نے وہ رائے علم کی بنا پر قائم کی ہے، یا قیاس پر، یا وہم پر، یا محض مشاہدۂ حسی پر۔ مثلاً ایک بچہ آگ کو دیکھتا ہے اور مجرد مشاہدۂ حسی کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ بڑا خوب صورت چمک دار کھلونا ہے۔ چناں چہ اس رائے کے نتیجہ میں اس سے یہ طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اُسی آگ کو دیکھ کر وہم سے یا قیاس سے یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اس کے اندر الوہیت ہے، یا یہ الوہیت کا مظہر ہے۔ چناں چہ اس رائے کی بنا پر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے ساتھ میرا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ میں اس کے آگے سر نیاز جھکا دوں۔ ایک تیسرا شخص اسی آگ کو دیکھ کر اس کی ماہیت اور اس کی صفات کی تحقیق کرتا ہے اور علم و تحقیق کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ پکانے اور جلانے اور تپانے والی ایک چیز ہے، اور میرے ساتھ اس کا تعلق وہ ہے جو ایک مخدوم کے ساتھ خادم کا تعلق ہوتا ہے۔ چناں چہ اس رائے کی بنا پر وہ آگ کو نہ کھلونا بناتا ہے نہ معبود، بلکہ اس سے حسب موقع پکانے اور جلانے اور تپانے کی خدمت لیتا ہے۔ اِن مختلف رویوں میں سے بچے اور آتش پرست کے رویے جاہلیت کے رویے ہیں، کیوں کہ بچے کی یہ رائے کہ آگ محض کھلونا ہے تجربہ سے غلط ثابت ہو جاتی ہے، اور آتش پرست کی یہ رائے کہ آگ خود اللہ ہے یا مظہر الوہیت ہے کسی ثبوتِ علمی پر مبنی نہیں بلکہ محض قیاس و وہم پر مبنی ہے۔ بہ خلاف اس کے آگ سے خدمت لینے والے کا رویہ علمی رویہ ہے۔ کیوں کہ آگ کے متعلق اس کی رائے علم پر مبنی ہے۔

زندگی کے بنیادی مسائل

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا اپنی نظر کو جزئیات سے کلّیات پر پھیلائیے۔ انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو موجود پاتا ہے۔ اس کے پاس ایک جسم ہے جس میں بہت سی قوتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے زمین و آسمان کی ایک عظیم الشان بساط پھیلی ہوئی ہے، جس میں بے حد و حساب اشیاء ہیں اور وہ اِن اشیاء سے کام لینے کی قدرت اپنے اندر پاتا ہے۔ اس کے گرد و پیش بہت سے انسان، جانور، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں، اور ان سب سے اس کی زندگی وابستہ ہے۔ اب کیا آپ کے نزدیک یہ بات قابلِ تصوّر ہے کہ وہ اِن چیزوں کے ساتھ کوئی رویّہ اختیار کر سکتا ہے جب تک کہ پہلے خود اپنے بارے میں، ان تمام موجودات کے بارے میں اور ان کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر لے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی راستہ اختیار کر سکتا ہے جب تک یہ طے نہ کر لے کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ ذمّہ دار ہوں یا غیر ذمّہ دار؟ خود مختار ہوں یا ماتحت؟ ماتحت ہوں تو کس کا، اور جواب دہ ہوں تو کس کے سامنے؟ میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں اور ہے تو کیا ہے؟ اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لیے کوئی مصرف تجویز کر سکتا ہے جب تک اس سوال کا فیصلہ نہ کر لے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اس کی اپنی مِلک ہیں یا کسی کا عطیہ ہیں؟ اِن کا حساب کوئی لینے والا ہے یا نہیں؟ اور ان کے استعمال کا ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ اِسی طرح کیا وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء کے متعلق کوئی طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے جب تک اس امر کا تعین نہ کر لے کہ اِن اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور؟ ان پر اس کے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود؟ اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ اسی طرح کیا وہ آپس میں اپنے ابنائے نوع کے برتاؤ کی کوئی شکل متعین کر سکتا ہے جب تک اس معاملے میں کوئی رائے قائم نہ کر لے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے؟ انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز کی بنیاد کیا ہے؟ اور دوستی و دشمنی، اتفاق و اختلاف، تعاون اور عدمِ تعاون کی اساس کن اُمور پر ہے؟ اسی طرح کیا وہ بہ حیثیت مجموعی اِس

دُنیا کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کرسکتا ہے جب تک اس معاملے میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ نظام کائنات کس قسم کا ہے اور اس میں میری حیثیت کیا ہے؟

جو مقدمہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اس کی بنا پر بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ایک نہ ایک رائے قائم کیے بغیر کوئی رویّہ اختیار کرنا غیر ممکن ہے۔ فی الواقع ہر انسان جو دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے ان سوالات کے متعلق شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے اور رکھنے پر مجبور ہے۔ کیوں کہ وہ اس رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نے ان سوالات پر فلسفیانہ غور وفکر کیا ہو اور واضح طور پر تنقیحات قائم کر کے ایک ایک سوال کا فیصلہ کیا ہو۔ نہیں، بہت سے آدمیوں کے ذہن میں ان سوالات کی سرے سے کوئی متعین صورت ہوتی ہی نہیں، نہ وہ کبھی ان پر بالارادہ سوچتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہر آدمی اجمالی طور سے ان سوالات کے متعلق منفی یا مثبت پہلو میں ایک رائے پر لازماً پہنچ جاتا ہے اور زندگی میں اس کا رویّہ جو بھی ہوتا ہے لازمی طور پر اُس رائے کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات جس طرح اشخاص کے معاملے میں صحیح ہے اسی طرح جماعتوں کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔ چوں کہ یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں اس لیے کسی نظامِ تمدن و تہذیب اور کسی ہیئتِ اجتماعی کے لیے کوئی لائحہ عمل بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان سوالات کا کوئی جواب متعیّن نہ کرلیا جائے۔ اور ان کا جواب جو بھی متعیّن کیا جائے گا اسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، اسی کی نوعیت کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی اور فی الجملہ پورا تمدن ویسا ہی رنگ اختیار کرے گا جیسا اس جواب کا مقتضا ہوگا۔ درحقیقت اس معاملے میں کوئی تخلّف ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ ایک شخص کا رویہ ہو یا ایک سوسائٹی کا، بہ ہر حال وہ ٹھیک وہی نوعیت اختیار کرے گا جو اِن سوالات کے جواب کی نوعیت ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر آپ چاہیں تو ایک شخص یا ایک جماعت کے رویّے کا تجزیہ کر کے بآسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس رویّے کی تہ میں زندگی کے اِن بنیادی سوالات کا کون سا جواب کام کر رہا ہے۔ کیوں کہ یہ بات قطعی محال ہے کہ کسی شخص

یا اجتماعی رویّے کی نوعیت کچھ ہو اور اِن سوالات کے جواب کی نوعیّت کچھ اور ہو۔ اختلاف زبانی دعوے اور واقعی رویّے کے درمیان تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن ان سوالات کا جو جواب درحقیقت نفس کے اندر متمکن ہے اس کی نوعیت اور عملی رویّے کی نوعیت میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اچھا اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہیے۔ زندگی کے یہ بنیادی مسائل جن کے متعلق ابھی آپ نے سُنا کہ ان کا کوئی حل اپنے ذہن میں متعین کیے بغیر آدمی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکتا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن کا کوئی جواب اُفق پر لکھا ہوا نہیں ہے کہ ہر انسان دُنیا میں آتے ہی اس کو پڑھ لے اور ان کا کوئی جواب ایسا بدیہی بھی نہیں ہے کہ ہر انسان کو خود بہ خود معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے ان کا کوئی ایک حل نہیں ہے، جس پر سارے انسان متفق ہوں۔ بلکہ ان کے بارے میں ہمیشہ انسانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ مختلف انسان مختلف طریقوں سے ان کو حل کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کو حل کرنے کی کیا کیا صورتیں ممکن ہیں، کیا کیا صورتیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اور ان مختلف صورتوں سے جو حل نکلتے ہیں وہ کس قسم کے ہیں؟

ان کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس پر اعتماد کرے اور حواس سے جیسا کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کی بنا پر ان امور کے متعلق ایک رائے قائم کر لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشاہدۂ حسّی کے ساتھ وہم و قیاس کو ملا کر ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبروں نے حقیقت کا براہ راست علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے ان مسائل کا جو حل بیان کیا ہے اس کو قبول کر لیا جائے۔

دنیا میں اب تک ان مسائل کے حل کی یہی تین صورتیں اختیار کی گئی ہیں، اور غالباً یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر صورت ایک جداگانہ طریقہ سے ان مسائل کو حل کرتی ہے، ہر ایک حل سے ایک خاص قسم کا رویّہ وجود میں آتا ہے اور ایک خاص نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن بنتا ہے جو اپنی بنیادی خصوصیات میں دوسرے تمام حلوں کے پیدا کردہ رویّوں سے مختلف ہوتا

ہے۔اب میں دکھانا چاہتا ہوں کہ ان مختلف طریقوں سے ان مسائل کے کیا حل نکلے ہیں، اور ہر ایک حل کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے۔

خالص جاہلیت

حواس پر اعتماد کر کے جب انسان ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اِس طرزِ فکر کی عین فطرت کے تقاضے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود وظہور ہے جس کے پیچھے کوئی مصلحت اور کوئی مقصد نہیں۔ یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے، یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا، لہٰذا وہ یا تو ہے ہی نہیں، یا اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شاید اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اس کو کسی نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا۔ بہ ہر حال یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قوئ اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں، اور اس کے گرد و پیش زمین کے دامن پر بے حد وحساب سامان پھیلا ہوا ہے جس پر یہ اپنے قوئ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی قوتوں کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ اپنی خواہشات وضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے۔ اور دنیا کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لیے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے۔ اُوپر کوئی صاحب امر نہیں جس کے سامنے انسان جواب دہ ہو، اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہٰذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمّہ دار ہستی ہے۔ اپنے لیے ضابطہ وقانون بنانا اور اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کرنا اور موجودات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا تعیّن کرنا اس کا اپنا کام ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی ہدایت ہے تو جانوروں کی زندگی میں، پتھروں کی سرگزشت میں، یا خود اپنی تاریخ کے تجربات میں ہے۔ اور یہ اگر کسی کے سامنے جواب دہ ہے تو

آپ اپنے سامنے یا اُس اقتدار کے سامنے ہے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے نتائج اِسی زندگی کی حد تک ہیں۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابل اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ ایک پورا نظریۂ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا جواب حسی مشاہدہ پر دیا گیا ہے۔ اور اس جواب کا ہر جز دوسرے جز کے ساتھ کم از کم ایک منطقی ربط، ایک مزاجی موافقت ضرور رکھتا ہے، جس کی وجہ سے انسان دنیا میں ایک ہموار و یکساں رویّہ اختیار کرسکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ جواب اور اس سے پیدا ہونے والا رویہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ اب اُس رویّہ پر ایک نگاہ ڈالیے جو اس جواب کی بنا پر آدمی دنیا میں اختیار کرتا ہے۔

انفرادی زندگی میں اس نقطۂ نگاہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اوّل سے لے کر آخر تک خود مختارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرلے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے جسم اور اپنی جسمانی قوتوں کا مالک سمجھے گا، اس لیے اپنے حسبِ منشا جس طرح چاہے گا انھیں استعمال کرے گا۔ دنیا کی جو چیزیں اس کے قبضۂ قدرت میں آئیں گی اور جن انسانوں پر اس کو اقتدار حاصل ہوگا ان سب کے ساتھ وہ اس طرح برتاؤ کرے گا جیسے کہ وہ ان کا مالک ہے۔ اس کے اختیارات کو محدود کرنے والی چیز صرف قوانینِ قدرت کی حدیں اور اجتماعی زندگی کی ناگزیر بندشیں ہوں گی۔ خود اس کے اپنے نفس میں کوئی ایسا اخلاقی احساس ـــ ذمے داری کا احساس اور کسی باز پرس کا خوف ـــ نہ ہوگا جو اسے شترِ بے مہار ہونے سے روکتا ہو۔ جہاں خارجی رکاوٹیں نہ ہوں، یا جہاں وہ ان رکاوٹوں کے علی الرغم کام کرنے پر قادر ہو، وہاں تو اس کے عقیدے کا فطری اقتضا یہی ہے کہ وہ ظالم، بد دیانت، شریر اور مفسد ہو۔ وہ فطرتاً خود غرض، مادہ پرست اور ابن الوقت ہوگا۔ اُس کی زندگی کا کوئی مقصد اپنی نفسانی خواہشات اور حیوانی ضروریات کی خدمت کے سوا نہ ہوگا اور اس کی نگاہ میں قدر و قیمت صرف ان چیزوں کی ہوگی جو اُس کے اِس مقصدِ زندگی کے لیے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔ افراد میں یہ سیرت و کردار پیدا ہونا اس عقیدے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ بے شک

یہ ممکن ہے کہ مصلحت اور دوراندیشی کی بنا پر ایسا شخص ہمدرد ہو، ایثار پیشہ ہو، اپنی قوم کی فلاح و ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کرتا ہو، اور فی الجملہ اپنی زندگی میں ایک طرح کے ذمے دارانہ اخلاق کا اظہار کرے۔ لیکن جب آپ اس کے اس رویّہ کا تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ اس کی خودغرضی و نفسانیت ہی کی توسیع ہے۔ وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہے اس لیے اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص زیادہ سے زیادہ بس ایک نیشنلسٹ ہی ہوسکتا ہے۔

پھر جو سوسائٹی اس ذہنیت کے افراد سے بنے گی اُس کی امتیازی خصوصیات یہ ہوں گی:

سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر قائم ہوگی، خواہ وہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کی حاکمیت ہو، یا جمہور کی حاکمیت زیادہ سے زیادہ بلند اجتماعی تصوّر جو قائم کیا جا سکے وہ بس دولت مشترکہ (Common Wealth) کا تصوّر ہوگا۔ اس مملکت میں قانون ساز انسان ہوں گے، تمام قوانین خواہش اور تجربی مصلحت کی بنا پر بنائے اور بدلے جائیں گے، اور منفعت پرستی و مصلحت پرستی ہی کے لحاظ سے پالیسیاں بھی بنائی اور بدلی جائیں گی۔ مملکت کے حدود میں وہ لوگ زور کر کے اُبھر آئیں گے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ چالاک، مکّار، جھوٹے، دغاباز، سنگ دل اور خبیث النفس ہوں گے؟ سوسائٹی کی رہ نمائی اور مملکت کی زمامِ کاران ہی کے ہاتھ میں ہوگی اور ان کی کتابِ آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوگا۔

تمدّن و معاشرت کا سارا نظام نفس پرستی پر قائم ہوگا۔ لذاتِ نفس کی طلب ہر اخلاقی قید سے آزاد ہوتی چلی جائے گی اور تمام اخلاقی معیار اس طرح قائم کیے جائیں گے کہ ان کی وجہ سے لذّتوں کے حصول میں کم سے کم رکاوٹ ہو۔

اسی ذہنیت سے آرٹ اور لٹریچر متاثر ہوں گے اور ان کے اندر عریانی و شہوانیت کے عناصر بڑھتے چلے جائیں گے۔

معاشی زندگی میں کبھی جاگیرداری سسٹم برسرِ عروج آئے گا، کبھی سرمایہ داری نظام اس

کی جگہ لے گا، اور کبھی مزدور شورش کر کے اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لیں گے۔ عدل سے بہ ہر حال معیشت کا رشتہ کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔ کیوں کہ دنیا اور اس کی دولت کے بارے میں اس سوسائٹی کے ہر فرد کا بنیادی رویہ اس تصوّر پر مبنی ہوگا کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جس پر حسبِ منشا اور حسبِ موقع ہاتھ مارنے کے لیے وہ آزاد ہے۔

پھر اس سوسائٹی میں افراد کو تیار کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کا جو نظام ہوگا اس کا مزاج بھی اسی تصوّرِ حیات اور اسی رویّہ کے مناسبِ حال ہوگا۔ اس میں ہر نئی آنے والی نسل کو دنیا اور انسان اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق وہی تصور دیا جائے گا جس کی تشریح میں نے اُوپر کی ہے۔ تمام معلومات، خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے متعلق ہوں، اُن کو ایسی ہی ترتیب کے ساتھ دی جائیں گی کہ آپ سے آپ اُن کے ذہن میں زندگی کا یہ تصوّر پیدا ہو جائے۔ اور پھر ساری تربیت اس ڈھنگ کی ہوگی کہ وہ زندگی میں یہی رویہ اختیار کرنے اور اسی طرز کی سوسائٹی میں کھپ جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس تعلیم و تربیت کی خصوصیات کے متعلق مجھے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ آپ لوگوں کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ جن درس گاہوں میں آپ تعلیم پا رہے ہیں وہ سب اسی نظریہ پر قائم ہوئی ہیں، اگرچہ ان کے نام اسلامیہ کالج اور مسلم یونی ورسٹی وغیرہ ہیں۔

یہ رویہ جس کی تشریح میں نے ابھی آپ کے سامنے کی ہے خالص جاہلیت کا رویّہ ہے۔ اس کی نوعیّت وہی ہے جو اُس بچہ کے رویّے کی نوعیت ہے جو محض حسی مشاہدے پر اعتماد کر کے آگ کو ایک خوب صورت کھلونا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اس مشاہدے کی غلطی فوراً تجربہ سے ظاہر ہو جاتی ہے، کیوں کہ جس آگ کو کھلونا سمجھ کر وہ دست اندازی کا رویّہ اختیار کرتا ہے وہ گرم آگ ہوتی ہے، ہاتھ لگاتے ہی فوراً بتا دیتی ہے کہ میں کھلونا نہیں ہوں۔ بہ خلاف اس کے یہاں مشاہدے کی غلطی بڑی دیر میں کھلتی ہے، بلکہ بہتوں پر کھلتی ہی نہیں۔ کیوں کہ جس آگ پر یہ ہاتھ ڈالتے ہیں اس کی آنچ دھیمی ہے، فوراً چرکا نہیں دیتی بلکہ صدیوں تک تپاتی رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تجربات سے سبق لینے کے لیے تیار ہو تو شب و روز کی زندگی میں اِس نظریہ کی بہ دولت افراد کی بے ایمانیوں، حکام کے مظالم، منصفوں کی بے انصافیوں، مال داروں کی

خود غرضیوں اور عام لوگوں کی بد اخلاقیوں کا جو تلخ تجربہ اس کو ہوتا ہے، اور بڑے پیمانے پر اسی نظریے سے قوم پرستی، امپیریلزم، جنگ و فساد، ملک گیری اور اقوام کشی کے جو شرارے نکلتے ہیں، ان کے چرکوں سے وہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ رویّہ جاہلیت کا رویہ ہے، علمی رویہ نہیں ہے۔ کیوں کہ انسان نے اپنے متعلق اور نظامِ کائنات کے متعلق جو رائے قائم کر کے یہ رویّہ اختیار کیا ہے وہ امرِ واقعہ کے مطابق نہیں ہے ورنہ اس سے یہ بُرے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔

اب ہمیں دوسرے طریقے کا جائزہ لینا چاہیے۔ زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم سے کام لے کر اِن مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس طریقے سے تین مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں اور ہر ایک رائے سے ایک خاص قسم کا رویہ پیدا ہوا ہے۔

شرک

ایک رائے یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام بے خداوند تو نہیں ہے مگر اس کا ایک خداوند (الٰہ یا رب) نہیں ہے بلکہ بہت سے خداوند (الٰہ) اور ارباب ہیں۔ کائنات کی مختلف قوتوں کا سررشتہ مختلف خداؤں کے ہاتھ میں ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت، کام یابی و ناکامی، نفع و نقصان بہت سی ہستیوں کی مہربانی و نامہربانی پر منحصر ہے۔ یہ رائے جن لوگوں نے اختیار کی ہے انھوں نے پھر اپنے وہم و قیاس سے کام لے کر یہ تعیّن کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدائی کی طاقتیں کہاں کہاں اور کس کس کے ہاتھ میں ہیں اور جن جن چیزوں پر بھی ان کی نگاہ جا کر ٹھہری ہے اُن ہی کو خدا مان لیا ہے۔

اس رائے کی بنا پر جو طرزِ عمل انسان اختیار کرتا ہے اس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں:

اوّلاً، اس سے آدمی کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ وہ کسی علمی ثبوت کے بغیر مجرد اپنے وہم و خیال سے بہت سی چیزوں کے متعلق یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ فوق الفطری طریقوں سے اس کی قسمت پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے وہ اچھے اثرات کی موہوم

امیدوار برے اثرات کے موہوم خوف میں مبتلا ہو کر اپنی بہت سی قوتیں لاحاصل طریقے سے ضائع کر دیتا ہے۔ کہیں کسی قبر سے اُمید لگاتا ہے کہ یہ میرا کام کر دے گی۔ کہیں کسی بُت پر بھروسا کرتا ہے کہ وہ میری قسمت بنا دے گا۔ کہیں کسی اور خیالی کارساز کو خوش کرنے کے لیے دوڑتا پھرتا ہے۔ کہیں کسی بُرے شگون سے دل شکستہ ہو جاتا ہے اور کہیں کسی اچھے شگون سے توقعات کے خیالی قلعے بنا لیتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کے خیالات اور اس کی کوششوں کو فطری تدابیر سے ہٹا کر ایک بالکل غیر فطری راستے پر ڈال دیتی ہیں۔

ثانیاً، اِس رائے کی وجہ سے پوجا پاٹ، نذر و نیاز اور دوسری رسموں کا ایک لمبا چوڑا دستورالعمل بنتا ہے، جس میں اُلجھ کر آدمی کی سعی و عمل کا ایک بڑا حصہ بے نتیجہ مشغولیتوں میں صرف ہو جاتا ہے۔

ثالثاً، جو لوگ اس مشرکانہ وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو بے وقوف بنا کر اپنے جال میں پھانس لینے کا چالاک آدمیوں کو خوب موقع مل جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ بن بیٹھتا ہے اور سورج، چاند اور دوسرے دیوتاؤں سے اپنا نسب ملا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہم بھی خداؤں میں سے ہیں اور تم ہمارے بندے ہو۔ کوئی پروہت یا مجاور بن بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ تمھارا نفع و نقصان جن سے وابستہ ہے ان سے ہمارا تعلق ہے اور تم ہمارے ہی واسطے سے اُن تک پہنچ سکتے ہو۔ کوئی پنڈت اور پیر بن جاتا ہے اور تعویذ گنڈوں اور منتروں اور عملیات کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری یہ چیزیں فوق الفطری طریقے سے تمھاری حاجتیں پوری کریں گی۔ پھر ان سب چالاک لوگوں کی نسلیں مستقل خاندانوں اور طبقوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جن کے حقوق، امتیازات، اور اثرات امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور گہری بنیادوں پر جمتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس عقیدہ کی بہ دولت عام انسانوں کی گردنوں پر شاہی خاندانوں، مذہبی عہدہ داروں اور روحانی پیشواؤں کی خدائی کا جو اسلّط ہوتا ہے اور یہ بناوٹی خدا اُن کو اس طرح اپنا خادم بناتے ہیں کہ گویا وہ اُن کے لیے دودھ دینے اور سواری اور بار برداری کی خدمت انجام دینے والے جانور ہیں۔

رابعاً، یہ نظریہ نہ تو علوم وفنون، فلسفہ وادب اور تمدن وسیاست کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور نہ ان خیالی خداؤں سے انسانوں کو کسی قسم کی ہدایت ہی ملتی ہے کہ وہ اس کی پابندی کریں۔ ان خداؤں سے تو انسان کا تعلق صرف اس حد تک محدود رہتا ہے کہ یہ اُن کی مہربانی واعانت حاصل کرنے کے لیے بس عبودیت کے چند مراسم ادا کردے۔ باقی رہے زندگی کے معاملات تو ان کے متعلق قوانین اور ضوابط بنانا اور عمل کے طریقے معیّن کرنا انسان کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اس طرح مشرک سوسائٹی عملاً ان ہی سب راہوں پر چلتی ہے جن کا ذکر خالص جاہلیت کے سلسلے میں ابھی میں آپ سے کر چکا ہوں۔ وہی اخلاق، وہی اعمال، وہی طرز تمدن، وہی سیاست، وہی نظامِ معیشت، اور وہی علم وادب۔ ان تمام حیثیتوں سے شرک کے رویّے اور خالص جاہلیت کے رویّے میں کوئی اصولی فرق نہیں ہوتا۔

رہبانیت

دوسری رائے جو مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم کو ملا کر قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی روح ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے اس قفس میں بند کی گئی ہے۔ لذّات وخواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں اصل میں یہ اس قید خانہ کے طوق وسلاسل ہیں۔ انسان جتنا اس دنیا اور اس کی چیزوں سے تعلق رکھے گا اتنا ہی ان زنجیروں میں پھنستا چلا جائے گا اور مزید عذاب کا مستحق ہوگا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ زندگی کے سارے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے، خواہشات کو مٹایا جائے، لذّات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبوں کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، ان تمام محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے جو گوشت و خون کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں اور اپنے اس دشمن (نفس وجسم) کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ رُوح پر اس کا تسلّط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائے گی اور نجات کے بلند مقام پر اڑنے کی طاقت حاصل کرلے گی۔

اس رائے سے جو رویّہ پیدا ہوتا ہے اس کی خصوصیات یہ ہیں:

اولاً، اس سے انسان کے تمام رجحانات، اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف اور تمدن سے وحشت کی طرف پھر جاتے ہیں۔ وہ دُنیا اور اس کی زندگی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے، ذمے داریوں سے بھاگتا ہے، اس کی ساری زندگی عدمِ تعاون اور ترکِ موالات کی زندگی بن جاتی ہے اور اس کے اخلاق زیادہ تر سلبی (Negative) نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی بہ دولت نیک لوگ دنیا کے کاروبار سے ہٹ کر اپنی نجات کی فکر میں گوشہ ہائے عزلت کی طرف چلے جاتے ہیں اور دنیا کے سارے معاملات شریر لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں۔

ثالثاً، تمدّن میں اس رائے کا اثر جس حد تک پہنچتا ہے اس سے لوگوں کے اندر سلبی اخلاقیات، غیر تمدنی (Un-Social) اور انفرادیت پسندانہ (Individualistic) رُجحانات اور مایوسانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کی عملی قوتیں سرد ہو جاتی ہیں۔ وہ ظالموں کے لیے نرم نوالہ بن جاتے ہیں اور ہر جابر حکومت ان کو آسانی سے قابو میں لا سکتی ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ عوام کو ظالموں کے لیے ذلول (Tame) بنانے میں جادو کی تاثیر رکھتا ہے۔

رابعاً، انسانی فطرت سے اس راہبانہ نظریہ کی مستقل جنگ رہتی ہے اور اکثر یہ اس سے شکست کھا جاتا ہے۔ پھر جب یہ شکست کھاتا ہے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اسے حیلوں کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے، کہیں عشقِ مجازی کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے اور کہیں ترکِ دنیا کے پردے میں وہ دنیا پرستی کی جاتی ہے جس کے آگے دنیا پرست بھی شرما جائیں۔

ہمہ اوست

تیسری رائے جو مشاہدے اور قیاس کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان اور کائنات کی تمام چیزیں بجائے خود غیر حقیقی ہیں ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ دراصل ایک

وجود نے ان ساری چیزوں کو خود اپنے ظہور کا واسطہ بنایا ہے اور وہی ان سب کے اندر کام کر رہا ہے۔ تفصیلات میں اس نظریہ کی بے شمار صورتیں ہیں، مگر ان ساری تفصیلات کے اندر قدرِ مشترک یہی ایک خیال ہے کہ تمام موجودات ایک ہی وجود کا ظہورِ خارجی ہیں اور دراصل موجود ہی ہے باقی کچھ نہیں۔

اس نظریہ کی بنا پر انسان جو رویہ اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہونے ہی میں شک ہو جاتا ہے کجا کہ وہ کوئی کام کرے۔ وہ اپنے آپ کو ایک کٹھ پتلی سمجھتا ہے جسے کوئی اور نچا رہا ہے یا جس کے اندر کوئی اور ناچ رہا ہے۔ وہ اپنے تخیلات کے نشے میں گم ہو جاتا ہے۔ اُس کے لیے نہ کوئی مقصدِ زندگی ہوتا ہے اور نہ کوئی راہِ عمل۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں خود تو کچھ ہوں ہی نہیں، نہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے، نہ میرے کیے سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اصل میں تو وہ وجودِ کلی جو مجھ میں اور تمام کائنات میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جو ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہے، سارے کام اسی کے ہیں اور وہی سب کچھ کرتا ہے وہ اگر مکمل ہے تو میں بھی مکمل ہوں، پھر کوشش کس چیز کے لیے؟ اور وہ اگر اپنی تکمیل کے لیے کوشاں ہے تو جس عالم گیر حرکت کے ساتھ وہ کمال کی طرف جا رہا ہے اسی کی لپیٹ میں ایک جز کی حیثیت سے میں بھی آپ سے آپ چلا جاؤں گا۔ میں ایک جز ہوں، مجھے کیا خبر کہ کل کدھر جا رہا ہے اور کدھر جانا چاہتا ہے؟

اس طرزِ خیال کے عملی نتائج قریب قریب وہی ہیں جو ابھی میں نے راہبانہ نظریہ کے سلسلے میں بیان کیے ہیں۔ بلکہ بعض حالات میں اس رائے کو اختیار کرنے والے کا طرزِ عمل اُن لوگوں کے رویّے سے ملتا جلتا ہے جو خالص جاہلیت کا نظریّہ اختیار کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اپنی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے اور پھر جدھر خواہشات لے جاتی ہیں اس طرف یہ سمجھتے ہوئے بے تکلف چلا جاتا ہے کہ جانے والا وجودِ کلی ہے نہ کہ میں۔

پہلے نظریے کی طرح یہ تینوں نظریے بھی جاہلیت کے نظریے ہیں اور اس بنا پر جو رویے ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی جاہلیت ہی کے رویے ہیں۔ اس لیے کہ اوّل تو ان میں سے کوئی

نظریہ بھی کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ محض خیالی اور قیاسی بنیادوں پر مختلف رائیں قائم کر لی گئی ہیں۔ دوسرے ان کا واقعہ کے خلاف ہونا تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی رائے بھی امرواقعی کے مطابق ہوتی تو اس کے مطابق عمل کرنے سے بُرے نتائج تجربے میں نہ آتے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کو جہاں کہیں انسان نے کھایا اس کے پیٹ میں درد ضرور ہوا تو اس تجربہ سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فی الواقع معدہ کی ساخت اور اس کی طبیعت سے یہ چیز مطابقت نہیں رکھتی۔ بالکل اسی طرح جب یہ حقیقت ہے کہ شرک، رہبانیت اور وجودیت کے نظریے اختیار کرنے سے انسان کو بہ حیثیتِ مجموعی نقصان ہی پہنچا تو یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی واقعہ اور حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔

اِسلام

اب ہمیں تیسری صورت کو لینا چاہیے جو زندگی کے اِن بنیادی مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے کی آخری صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ پیغمبروں نے ان مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اُسے قبول کیا جائے۔

اس طریقے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی اجنبی مقام پر آپ ہوں اور آپ کو خود اس مقام کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہو تو آپ کسی دوسرے شخص سے دریافت کریں اور اس کی رہ نمائی میں وہاں کی سیر کریں۔ ایسی صورتِ حال جب پیش آتی ہے تو آپ پہلے اس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو خود واقف کار ہونے کا دعویٰ کرے۔ پھر آپ قرائن سے اس امر کا اطمینان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ پھر آپ اس کی رہ نمائی میں چل کر دیکھتے ہیں۔ اور جب تجربہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جو عمل آپ نے کیا اس سے کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلا تو آپ کو پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ شخص واقف کار تھا اور اس جگہ کے متعلق جو معلومات اس نے دی تھیں وہ صحیح تھیں۔ یہ ایک علمی طریقہ ہے، اور اگر کوئی دوسرا طریقِ علمی ممکن نہ ہو تو پھر رائے قائم کرنے کے لیے یہی ایک صحیح طریقہ ہوسکتا ہے۔

اب دیکھیے، دنیا آپ کے لیے ایک اجنبی جگہ ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا انتظام کس قسم کا ہے، کس آئین پر یہ کارخانہ چل رہا ہے، اس کے اندر آپ کی کیا حیثیت ہے اور یہاں آپ کے لیے کیا رویہ مناسب ہے۔ آپ نے پہلے یہ رائے قائم کی کہ جیسا بہ ظاہر نظر آتا ہے اصل حقیقت بھی وہی ہے۔ آپ نے اس رائے پر عمل کیا۔ مگر نتیجہ غلط نکلا۔ پھر آپ نے قیاس اور گمان کی بنا پر مختلف رائیں قائم کیں اور ہر ایک پر عمل کر کے دیکھا، مگر ہر صورت میں نتیجہ غلط ہی رہا۔ اس کے بعد آخری صورت یہی ہے کہ آپ پیغمبروں کی طرف رجوع کریں۔ یہ لوگ واقف کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے حالات کی جتنی چھان بین کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سچے، نہایت امین، نہایت نیک، نہایت بے غرض اور نہایت صحیح الدماغ لوگ ہیں۔ لہٰذا بادی النظر میں ان پر اعتماد کرنے کے لیے کافی وجہ موجود ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا کے متعلق اور دُنیا میں آپ کی حیثیت کے متعلق جو معلومات وہ دیتے ہیں وہ کہاں تک لگتی ہوئی ہیں، اُن کے خلاف کوئی عملی ثبوت تو نہیں ہے، اور اُن کے مطابق جو رویہ دنیا میں اختیار کیا گیا وہ تجربہ سے کیسا ثابت ہوا۔ اگر تحقیق سے ان تینوں باتوں کا جواب بھی اطمینان بخش نکلے تو ان کی رہ نمائی پر ایمان لے آنا چاہیے اور زندگی میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو اس نظریہ کے مطابق ہو۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا پچھلے جاہلیت کے طریقوں کے مقابلے میں یہ طریقہ علمی طریقہ ہے۔ اور اگر اس علم کے آگے آدمی سرِ تسلیم خم کر دے، اگر خود سری اور خود رائی کو چھوڑ کر اس علم کی اتباع کرے، اور اپنے رویہ کو انھی حدود کا پابند بنا دے جو اس علم نے قائم کی ہیں، تو اسی طریقہ کا نام ''اسلامی طریقہ'' ہے۔

انبیاء کا نظریۂ کائنات وانسان

پیغمبر کہتے ہیں:

یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جز انسان

بھی ہے، کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم، باضابطہ سلطنت ہے، اللہ نے اس کو بنایا ہے، وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کا اکیلا حاکم ہے۔ یہ ایک کلی نظام (Totalitaria System) ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس مقتدرِ اعلیٰ کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظامِ عالم میں کام کر رہی ہیں، اسی کے زیرِ حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے، یا اس کے اذن کے بغیر اپنے اختیار سے کوئی حرکت کرے۔ اس ہمہ گیر سسٹم کے اندر کسی کی خود مختاری (Independence) اور غیر ذمے داری (Irresponsibility) کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرتاً ہو سکتی ہے۔

انسان یہاں پیدائشی رعیت (Born Subject) ہے۔ رعیت ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیّت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ خود اپنے لیے طریقِ زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔

یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے کہ اپنی ملک میں تصرّف کرنے کا ضابطہ خود بنائے۔ اس کا جسم اور اس کی ساری قوتیں اللہ کی ملک اور اُس کا عطیہ ہیں۔ لہٰذا یہ اُن کو خود اپنے منشا کے مطابق استعمال کرنے کا حق دار نہیں ہے، بلکہ جس نے یہ چیزیں اس کو عطا کی ہیں اُسی کی مرضی کے مطابق اسے اُن کو استعمال کرنا چاہیے۔

اسی طرح جو اشیاء اس کے گرد و پیش دنیا میں پائی جاتی ہیں ـــ زمین، جانور، پانی، نباتات، معدنیات وغیرہ ـــ یہ سب اللہ کی ملک ہیں۔ انسان اِن کا مالک نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کو ان پر بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اسے اُن کے ساتھ اُس قانون کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے جو اصل مالک نے مقرر کیا ہے۔

اسی طرح وہ تمام انسان بھی جو زمین پر بستے ہیں، اور جن کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے، اللہ کی رعیّت ہیں۔ لہٰذا ان کو اپنے باہمی تعلقات کے بارے میں خود اصول اور

ضابطے مقرر کر لینے کا حق نہیں ہے۔ ان کے جملہ تعلقات خدا کے بنائے ہوئے قانون پر مبنی ہونے چاہییں۔

رہی یہ بات کہ وہ خدا کا قانون کیا ہے؟ تو پیغمبر کہتے ہیں کہ جس ذریعۂ علم کی بنا پر ہم تمھیں دنیا کی اور خود تمھاری یہ حقیقت بتا رہے ہیں، اُسی ذریعۂ علم سے ہم کو خدا کا قانون بھی معلوم ہوا ہے۔ خدا نے خود ہم کو یہ علم دیا ہے اور ہم کو اس بات پر مامور کیا ہے کہ یہ علم تم تک پہنچا دیں۔ لہٰذا تم ہم پر اعتماد کرو، ہمیں اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرو، اور ہم سے اس کا مستند قانون لو۔

پھر پیغمبر ہم سے کہتے ہیں کہ یہ جو تم بہ ظاہر دیکھتے ہو کہ سلطنتِ عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے نہ اس کے کارپرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور یہ جو تم ایک طرح کی خود مختاری اپنے اندر محسوس کرتے ہو کہ جس طرح چاہو کام کرو، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتے ہو اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتے ہو، ہر صورت میں تم کو رزق ملتا ہے، وسائلِ کار بہم پہنچتے ہیں اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی، یہ سب دراصل تمھاری آزمائش کے لیے ہے۔ چوں کہ تم کو عقل، قوتِ استنباط اور قوتِ انتخاب دی گئی ہے، اس لیے مالک نے اپنے آپ کو اور اپنے نظامِ سلطنت کو تمھاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ وہ تمھیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اپنی قوتوں سے کس طرح کام لیتے ہو۔ اُس نے تم کو سمجھ بوجھ، انتخاب کی آزادی (Freedom Of Choice) اور ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) عطا کر کے چھوڑ دیا ہے۔ اب اگر تم اپنی رعیّت ہونے کی حیثیت کو سمجھو اور بہ رضا و رغبت اِس حیثیت کو اختیار کرو، بغیر اس کے کہ تم پر اس حیثیت میں رہنے کے لیے کوئی جبر ہو، تو اپنے مالک کی آزمائش میں کام یاب ہو گے۔ اور اگر رعیّت ہونے کی حیثیت کو نہ سمجھو، یا سمجھنے کے باوجود باغیانہ روش اختیار کرو تو امتحان میں ناکام ہو جاؤ گے۔ اسی امتحان کی غرض سے تم کو دنیا میں کچھ اختیارات دیے گئے ہیں، دنیا کی بہت سی چیزیں تمھارے قبضۂ قدرت میں دی گئی ہیں اور تم کو عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے۔

اس کے بعد پیغمبر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی چوں کہ امتحان کی مہلت ہے لہٰذا یہاں نہ حساب ہے نہ جزا سزا[1] یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے لازم نہیں کہ وہ کسی عملِ نیک کا انعام ہی ہو۔ وہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدامِ حکومت، اسبابِ زندگی، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تا کہ تم ان پر کام کر کے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بُری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی لازماً کسی عملِ بد کی سزا نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض قانونِ فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔[2] بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں۔[3] اور بعض اس وجہ سے

(۱) اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں، دراصل عالمِ طبیعی ہے نہ کہ عالمِ اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں ہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اس لیے موجودہ نظامِ کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر مترتب ہو سکتے ہیں تو صرف اسی حد تک جس حد تک کہ قوانینِ طبیعی ان کو مترتب ہونے کا موقع دیں۔ ورنہ جہاں قوانینِ طبیعی ان کے ظہور کے لیے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کے اخلاقی نتیجہ کا مترتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانینِ طبیعی اس کا سراغ لگنے اور اس کے اُوپر جُرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار ہوں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مترتب ہوگا ہی نہیں اور اگر وہ سازگاری کر بھی لیں تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مترتب نہ ہو سکیں گے، کیوں کہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دیا جانا اُس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا تھا۔ اسی لیے یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی۔ دارالجزا ہونے کے لیے ایک ایسا نظامِ عالم درکار ہے جس میں موجودہ نظامِ عالم کے برعکس حکمراں قوانین، قوانینِ اخلاقی ہوں اور قوانینِ طبیعی محض اُن کے خادم کی حیثیت رکھتے ہوں۔

(۲) مثلاً زنا کرنے والے کا بیماری میں مبتلا ہونا، کہ یہ اس گناہ کی اخلاقی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا طبیعی نتیجہ ہے۔ اگر وہ علاج کرنے میں کام یاب ہو جائے تو بیماری سے بچ جائے گا مگر اخلاقی سزا سے نہ بچے گا۔ اگر توبہ کرے تو اخلاقی سزا سے بچ جائے گا مگر بیماری دُور نہ ہوگی۔

(۳) مثلاً کسی شخص کا افلاس میں مبتلا ہونا اس کے حق میں اس امر کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے یا جائز وسائل ہی سے کام لینے پر ثابت قدم رہتا ہے، مصائب کے ہجوم میں حق پرستی پر قائم رہتا ہے یا مضطرب ہو کر باطل کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔

پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کر کے جب تم ایک رویّہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ تم کو چوٹ لگتی ہے[1]۔ بہر حال یہ دنیا دار الجزا نہیں ہے بلکہ دار الامتحان ہے۔ یہاں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، قابل ترک یا قابل اخذ ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ مہلت کی زندگی ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تمھارے پورے کارنامے کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے یا ناکام۔ اور وہاں جس چیز پر کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً تم نے اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکمِ حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی تعلیم و ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانا یا نہیں۔ اور ثانیاً، اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد آزادیِ انتخاب رکھنے کے باوجود، تم نے اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے حکمِ شرعی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا یا نہیں۔

نظریۂ اسلامی کی تنقید

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو پیغمبروں نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہّ ہے۔ اس کے تمام اجزا میں ایک منطقی ربط ہے۔ کوئی جز دوسرے جز سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعاتِ عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثارِ کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز بھی مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جاسکتی ہو۔ لہٰذا یہ ایک علمی نظریہ (Scientific Theory) ہے۔ ''علمی نظریہ'' کی جو تعریف بھی کی جائے وہ اس پر صادق آتی ہے۔

پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو۔ لہٰذا یہ اپنی

---

(۱) یعنی جب انسان اس دنیا کو بے خدا اور اپنے آپ کو خود مختار سمجھ کر کام کرتا ہے تو چوں کہ فی الواقع نہ دنیا بے خدا ہے اور نہ انسان خود مختار، اس لیے امرِ واقعی کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے وہ لامحالہ چوٹ کھاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آگ کو کھلونا سمجھ کر آپ ہاتھ میں پکڑ لیں تو ہاتھ جل جائے گا کیوں کہ آپ نے امرِ واقعی کے خلاف رویہ اختیار کیا۔

جگہ پر قائم ہے۔ٹوٹے ہوئے نظریات میں اس کو شمار نہیں کیا جاسکتا(۱)

پھر نظامِ عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اس سے یہ نظریہ نہایت اغلب (Most Probable) نظر آتا ہے۔کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرین دانش ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے، بہ نسبت اس کے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور ایک ہی مختارکل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اس کے کہ یہ لامرکزی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے، بہ نسبت اس کے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظامِ کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جز ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خودمختاری و غیر ذمے داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیے۔اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول (Most Reasonable) نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابلِ عمل (Practicable) نظریہ ہے۔زندگی کی ایک پوری اسکیم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریے پر بنتی ہے۔فلسفہ اور اخلاق کے لیے، علوم وفنون کے لیے، ادب اور ہنر کے لیے، سیاست اور انتظامِ مملکت کے لیے، صلح وجنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ہر ضرورت کے لیے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویّہ متعیّن کرنے کے لیے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

---

(۱) کسی زمانے کے علمی نظریات کا اس کے خلاف ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ نظریہ ٹوٹ گیا۔ایک علمی نظریہ کو صرف حقائق (Facts) توڑ سکتے ہیں نہ کہ نظریات۔لہٰذا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ انبیاء کے پیش کیے ہوئے اس تصوّر کائنات وانسان کو کس ثابت شدہ حقیقت نے غلط ثابت کر دیا ہے، اس کو ٹوٹے ہوئے نظریات میں شمار کرنا قطعاً ایک غیر علمی اور متعصبانہ ادّعا ہے۔

اب ہمیں صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اس نظریہ سے دنیا کی زندگی میں کس قسم کا رویّہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

انفرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے برعکس ایک نہایت ذمے دارانہ اور نہایت منضبط (Dicipline) رویّہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اس کی طاقتوں کو اور دنیا اور اس کی کسی چیز کو بھی اپنی مِلک سمجھ کر خودمختارانہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی ملک سمجھ کر صرف اس کے قانون کی پابندی میں استعمال کرے۔ ہر چیز کو جو اُسے حاصل ہے خدا کی امانت سمجھے اور یہ سمجھتے ہوئے اُس میں تصرف کرے کہ مجھے اس امانت کا پورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی اس کو دینا ہے جس کی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ کوئی دل میں چھپا ہوا ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہر حال میں ایک ضابطہ کا پابند ہوگا۔ وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شترِ بے مہار نہیں بن سکتا۔ وہ ظالم اور خائن نہیں ہوسکتا۔ اس کی سیرت پر کامل اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ وہ ضابطہ کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہوجاتا ہے جو اُسے ان مواقع پر بھی راستی اور حق پر قائم رکھتا ہے جہاں اُسے کسی دنیوی طاقت کی باز پرس کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احساس وہ چیز ہے جس سے بڑھ کر سوسائٹی کو قابلِ اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصوّر میں نہیں آسکتا۔

مزید برآں یہ نظریہ آدمی کو نہ صرف سعی و جہد کا آدمی بناتا ہے بلکہ اس کی سعی و جہد کو خودغرضی، نفس پرستی، یا قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اور بلندتر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں بے کار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے کام کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی اپنے لیے یا اپنے دوسرے متعلقین کے لیے نہیں ہے بلکہ اُس کام کے لیے ہے جس میں خدا کی رضا ہو، اور میں یونہی چھوڑ نہ جاؤں گا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائے گا کہ میں نے اپنے وقت کا اور اپنی قوتوں کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان سے بہتر انفرادی رویہ کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اب اجتماعی پہلو میں دیکھیے:

سب سے پہلے تو یہ نظریّہ انسانی اجتماع کی بنیاد بدل دیتا ہے۔ اس نظریّہ کی رُو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیّت ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق یکساں، سب کی حیثیت یکساں اور سب کے لیے مواقع یکساں۔ کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقہ، کسی قوم، کسی نسل کے لیے دوسرے انسانوں پر نہ کسی قسم کی برتری و فوقیت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام خرابیاں یک لخت دُور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، نوابی (Aristocracy) برہمنیت و پاپائیت اور آمریت سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر یہ چیز قبیلے، قوم، نسل، وطن اور رنگ کے تعصبات کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے جن کی بہ دولت دنیا میں سب سے زیادہ خون ریزیاں ہوئی ہیں۔ اس نظریّہ کی رُو سے تمام روئے زمین خدا کا ملک ہے، تمام انسان آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت، یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق کی پاکیزگی اور خدا کے خوف پر ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اصلاح و تقویٰ پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریہ میں کلیتاً تبدیل کر دی گئی ہے۔ انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی بنا ٹھیرایا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور ان حصوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں۔ کیوں کہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو آدمی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اس کے یہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بنا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی پر رکھتا ہے۔ جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کر لیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کر لیں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ دوسری جماعت۔ اس

طرح تمام اختلافات مٹا کر صرف ایک اختلاف باقی رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابلِ عبور ہے۔ کیوں کہ ہر وقت ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرزِ زندگی بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔ اس طرح اگر دنیا میں کوئی عالم گیر بین الاقوامی برادری بننی ممکن ہے تو وہ اسی نظریے پر بن سکتی ہے۔ دوسرے تمام نظریات انسانیت کو پھاڑنے والے ہیں، جمع کرنے والے نہیں ہیں۔

ان تمام اصلاحات کے بعد جو سوسائٹی اس نظریہ پر بنتی ہے اس کی ذہنیت، اسپرٹ، اور اجتماعی تعمیر (Social Structure) بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں اسٹیٹ انسان کی حاکمیت پر نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت پر بنتا ہے[1]۔ حکومت خدا کی ہوتی ہے۔ قانون خدا کا ہوتا ہے۔ انسان صرف خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ چیز اوّل تو اُن ساری خرابیوں کو دُور کر دیتی ہے جو انسان پر انسان کی حکومت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ایک عظیم الشان فرق جو اس نظریہ پر اسٹیٹ بننے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کے پورے نظام میں عبادت اور تقویٰ کی اسپرٹ پھیل جاتی ہے۔ راعی اور رعیّت دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہِ راست اُس خدا سے ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ ٹیکس دینے والا یہ سمجھ کر ٹیکس دیتا ہے کہ وہ خدا کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اس ٹیکس کو خرچ کرنے والے یہ سمجھتے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی سے لے کر ایک جج اور گورنر تک ہر کارندۂ حکومت اپنی ڈیوٹی اُسی ذہنیت کے ساتھ انجام دیتا ہے جس ذہنیت کے ساتھ وہ نماز پڑھتا ہے۔ دونوں کام اس کے لیے یکساں عبادت ہیں اور دونوں میں وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کے لیے چنتے ہیں ان میں سب سے پہلے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوفِ خدا اور امانت وصداقت کی صفت ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ اُبھر کر آتے ہیں اور اختیارات اُن کے ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں جو سوسائٹی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

---

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "اسلام کا نظریۂ سیاسی۔"

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ تقوئ اور طہارتِ اخلاق کی یہی اسپرٹ پھیلا دیتا ہے۔ اس میں نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی ہوتی ہے، ہر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون چوں کہ اُس نے بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم بھی ہے، اس لیے اِس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اس کی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ میں اُس پوری اجتماعی عمارت کا نقشہ پیش کروں جو اس نظریہ پر بنتی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں نے جو نظریۂ کائنات و انسان پیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویّہ پیدا کرتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ یہ محض کاغذ پر ایک خیالی نقشہ (Utopia) ہو۔ بلکہ تاریخ میں اس نظریہ پر ایک اجتماعی نظام اور ایک اسٹیٹ بنا کر دکھایا جا چکا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ جیسے افراد اس نظریہ پر تیار کیے گئے تھے نہ اس سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے اور نہ اس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک صحرائی عورت کو زنا سے حمل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ میرے لیے اس جُرم کی سزا سنگ ساری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس پر سزا نافذ کی جائے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو، اور بغیر کسی مچلکہ و ضمانت کے اُسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ پھر صحرا سے آتی ہے اور سزا دیے جانے کی درخواست کرتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو دُودھ پلا اور جب دُودھ پلانے کی مدّت ختم ہو جائے تب آئیو۔ پھر وہ صحرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے اور کوئی پولس کی نگرانی اس پر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدّت ختم ہونے کے بعد وہ پھر آ کر التجا کرتی ہے کہ اب اسے سزا دے کر اُس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چناں چہ اسے سنگ سار کیا جاتا ہے اور جب وہ مر جاتی ہے تو اُس کے لیے دُعائے رحمت کی جاتی ہے۔ اور جب ایک شخص کی زبان سے

اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ ’’خدا کی قسم! اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔‘‘ یہ تو اس سوسائٹی کے افراد کا حال تھا اور اس اسٹیٹ کا حال یہ تھا کہ جس حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی تھی اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے معمور ہو رہے تھے، اس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تنخواہ لیتا تھا، اور اس کے شہریوں میں ڈھونڈے سے بھی بہ مشکل کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربہ کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیاء نے نظامِ کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان کے لیے کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ خدا، فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہِ راست عینی مشاہدہ تو اُسے بہ ہر حال حاصل نہیں ہوسکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربہ سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع سسٹم میں کیا خرابی پیدا ہوگئی ہے تو مختلف دوائیں دے کر دیکھتا ہے، اور جو دوا اس اندھیری کوٹھڑی میں ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتی ہے اس کا مرض کا دُور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ سسٹم میں فی الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اس کے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کی کل کسی دوسرے نظریہ سے درست نہیں ہوتی اور صرف انبیاء کے نظریہ ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے، فی الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور واقعی اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامۂ حیاتِ دنیوی کا حساب دینا ہے۔

باب پنجم:

اسلام اور جدیدیت

(1) جدیدیت کا تعارف

(2) جدید "ازم" اور فکری چیلنجز

(3) اسلام اور مغربی افکار

(4) جدید دور میں اسلامی رہنمائی

مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام

مابعد جدیدیت (Post modernism) یا پس جدیدیت دراصل جدیدیت یا ماڈرن ازم کے ردّعمل کا نام ہے۔ اس لیے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ جدیدیت کو سمجھا جائے۔

جدیدیت کیا ہے؟

جدیدیت دراصل ان نظریاتی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تحریکوں کے مجموعہ کا نام ہے جو ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدیوں کے یورپ میں روایت پسندی (Traditionalism) اور کلیسائی استبداد کے ردِّعمل میں پیدا ہوئیں۔

یہ وہ دور تھا، جب یورپ میں کلیسا کا ظلم اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ تنگ نظر پادریوں نے قدیم یونانی فلسفہ اور عیسائی معتقدات کے امتزاج سے کچھ خودساختہ نظریات قائم کر رکھے تھے اور ان نظریات کے خلاف اُٹھنے والی کسی بھی آواز کو وہ مذہب کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ شاہی حکومتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اُنہوں نے ایک ایسا استبدادی نظام قائم کر رکھا تھا جس میں کسی بھی آزاد علمی تحریک کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

دوسری طرف اسپین کی اسلامی تہذیب کے ساتھ طویل تعامل کی وجہ سے مسیحی دُنیا میں بھی حریتِ فکر کی ہوائیں آنے لگی تھیں۔ قرطبہ اور غرناطہ میں حاصل شدہ تجرباتی سائنس کے درس رنگ لا رہے تھے اور یورپ کے سائنس دان آزاد تجربات کرنے لگے تھے۔ حریتِ

انسانی اور مساوات کے اسلامی تصور کے اثرات نے جنوبی اٹلی اور صقلیہ میں انسان دوستی (Humanism) کی جدید تحریکیں پیدا کی تھیں۔[۱]

ان سب عوامل نے مل کر کلیسا کے استبداد کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا کیا اور جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ چونکہ اس تحریک سے قبل یورپ میں شدید نوعیت کی دقیانوسیت اور روایت پرستی کا دَور دورہ تھا، اس لیے اس تحریک نے پورے عہدِ وسطیٰ کو تاریک دور قرار دیا۔ مذہبی عصبیتوں، روایت پسندی اور تنگ نظری کے خاتمے کو اپنا اصل ہدف بنایا۔ شدید ردِ عمل نے اس تحریک کو دوسری انتہا پر پہنچا دیا اور روایت پرستی اور عصبیت کے خلاف جدوجہد کرتے کرتے یہ تحریک مذہب اور مذہبی معتقدات ہی کے خلاف ہوگئی۔

جدیدیت کی اس تحریک کی نظریاتی بنیادیں فرانسس بیکن،[۲] رینے ڈیکارٹ،[۳] تھامس ہوبس،[۴] وغیرہ مفکرین کے افکار میں پائی جاتی ہیں، جن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ دُنیا اور کائنات عقل، تجربے اور مشاہدات کے ذریعے قابلِ دریافت (knowable) ہے اور اس کے تمام حقائق تک سائنسی طریقوں سے ہی رسائی ممکن ہے۔ اس لیے حقائق کی دریافت کے لیے کسی اور سرچشمہ کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کا کہیں وجود ہے۔ صرف وہی حقائق قابلِ اعتبار ہیں جو عقل، تجربے اور مشاہدے کی مذکورہ کسوٹیوں پر کھرے ثابت ہوں۔ ان فلسفیوں نے مابعدالطبیعیاتی مزعومات (metaphysical contentions) اور مذہبی دعوؤں کو اس وجہ سے قابلِ ردّ قرار دیا کہ وہ ان کسوٹیوں پر پورے نہیں اُترتے۔ ڈیکارٹ نے "I think therefore I am" (مَیں سوچتا ہوں، اس لیے مَیں ہوں) کا مشہور اعلان کیا جو جدید مغربی فلسفے کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی کا شعوری عمل (Conscious act of ego) سچائی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔

پاسکل، مانٹسکیو، ڈیڈارات، وسلی، ہیوم اور والٹیر جیسے مفکرین نے بھی عقل کی لامحدود بالادستی اور واحد سرچشمۂ علم ہونے کے اس تصور کو عام کیا۔ یہ افکار عقل پرستی

(Rationalism) کہلاتے ہیں اور جدیدیت کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ جدیدیت کی تعریف ہی یوں کی گئی کہ جدیدیت وہ روشن خیالی اور انسان دوستی ہے جو کسی بھی ہستی کی بالادستی اور روایت کو مسترد کرتی ہے اور صرف عقل اور سائنسی علوم کو ہی تسلیم کرتی ہے۔ یہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ سچائی اور معنی کا واحد منبع خود مختار فرد کی عقل ہے--- کارتیسی اصول: فکر کردم پس ہستم۔[۵]

اس تحریک نے مذہبی محاذ پر الحاد اور تشکیک کو جنم دیا۔ والٹیر[٦] جیسے الحاد کے علَم برداروں نے مذہب کا کلیتًا انکار کر دیا، جب کہ ہیگل جیسے متشکک مذہب کو تسلیم تو کرتے ہیں، لیکن اسے عقل کے تابع بتاتے ہیں اور مذہبی حقائق کو بھی دیگر عقلی مفروضات کی طرح قابلِ تغیر قرار دیتے ہیں۔

سیاسی محاذ پر اس تحریک نے انسانی حریت کا تصور پیش کیا۔ آزادئ فکر، آزادئ اظہار، اور حقوقِ انسانی کے تصورات عام کیے۔ تھامس ہابس نے حتمی اقتدار اعلیٰ (Absolute Sovereignty) کے تصور کو سیاسی فلسفے کی بنیاد قرار دیا۔ جان لاک نے اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے عوام کو اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا۔ والٹیر نے انسانی حریت کا تصور پیش کیا۔ مانٹسکیو[۷] اور روسو[۸] نے ایسی ریاست کے تصورات پیش کیے جس میں انسانوں کی آزادی اور ان کے حقوق کا احترام کیا جاتا ہے اور حکمرانوں کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔

جدیدیت کی تحریک نے قوم پرستی اور قومی ریاستوں کا تصور بھی عام کیا۔ انھی افکار کے بطن سے جدید دور میں جمہوریت نے جنم لیا۔ اور یورپ اور شمالی امریکا کے اکثر ملکوں میں خود مختار جمہوری قومی ریاستیں قائم ہوئیں۔

معاشی محاذ پر اس تحریک نے اوّل تو سرمایہ دارانہ معیشت اور نئے صنعتی معاشرے کو جنم دیا جس کی بنیاد ایڈم اسمتھ کی معاشی فکر تھی جو صنعت کاری، آزادانہ معیشت اور کھلے بازار کی پالیسیوں سے عبارت تھی۔[۹] نئے صنعتی معاشرے میں جب مزدوروں کا استحصال شروع

ہوا تو جدیدیت ہی کے بطن سے مارکسی فلسفہ پیدا ہوا، جو ایک ایسے غیر طبقاتی سماج کا تصور پیش کرتا تھا، جس میں محنت کش کو بالادستی حاصل ہو۔[۱۰]

اخلاقی محاذ پر اس تحریک نے افادیت پسندی (Utilitarianism) کا تصور عام کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اخلاقی قدروں کا تعلق افادیت سے ہے۔ جو رویے سماج کے لیے فائدہ مند ہیں، وہ جائز اور جو سماج کے لیے نقصان دہ ہیں، وہ ناجائز رویے ہیں۔ اور یہ کہ افادیتِ اخلاق کی واحد کسوٹی ہے۔ افادیت کے تصور نے قدیم جنسی اخلاقیات اور خاندان کے روایتی ادارے کی افادیت کو چیلنج کیا، جس کے نتیجے میں جدید اباحیت (permissiveness) کا آغاز ہوا۔

جدیدیت ہی کے بطن سے نئے صنعتی معاشرے میں نسائیت (Feminism) کی تحریک پیدا ہوئی جو مرد و زن کی مساوات کی علم بردار تھی اور عورتوں کو ہر حیثیت سے مردوں کے مساوی مقام دلانا اس کا نصب العین تھا۔

انقلاب فرانس، برطانیہ میں جمہوریت کی تحریک، امریکا کی آزادی کی تحریک اور اکثر یورپی ممالک کی تحریکیں جدیدیت کے ان افکار ہی سے متاثر تھیں۔ ۲۰ ویں صدی کے آتے آتے یورپ اور شمالی امریکا کے اکثر ممالک ان افکار کے پُر جوش مبلغ اور داعی بن گئے۔ جدیدیت کو روشن خیالی (Enlightenment) اور نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے نام بھی دیے گئے اور بڑی طاقتوں کی پشت پناہی سے روشن خیالی کا منصوبہ ایک عالمی منصوبہ بن گیا۔

چنانچہ ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر میں مغربی ممالک کا واحد نصب العین تیسری دُنیا میں روایت پسندی سے مقابلہ کرنا اور جدیدیت کو فروغ دینا قرار پایا۔ آزادی، جمہوریت، مساواتِ مرد و زن، سائنسی طرزِ فکر، سیکولرزم وغیرہ جیسی قدروں کو دُنیا بھر میں عام کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ معاشی فکر کے معاملے میں مغرب سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ دھڑوں میں ضرور منقسم رہا، لیکن سیاسی، سماجی اور نظریاتی سطح پر جدیدیت کے افکار بالاتفاق جدید مغرب

کے رہنما افکار بنے رہے، جن کی دُنیا بھر میں اشاعت اور نفاذ کے لیے ترسیل و اشاعت کے علاوہ ترغیب و تنفیذ کے تمام جائز و ناجائز طریقے اختیار کیے گئے۔ تیسری دُنیا میں ایسے پٹھو حکمرانوں کو بٹھایا گیا جو عوام کی مرضی کے خلاف زبردستی ترقی کے جدید ماڈل ان پر تھوپنے پر مامور رہے۔ اسلامی دُنیا میں خصوصاً اسلامی تہذیبی روایات کی بیخ کنی کو جدیدیت کا اہم ہدف سمجھا گیا۔ ترکی، تیونس اور سابق سویت یونین میں شامل وسط ایشیا کے علاقوں میں مذہبی روایات سے مقابلے کے لیے ایک سخت ظالمانہ اور استبدادی نظام قائم کیا گیا۔

مابعد جدیدیت کیا ہے؟

جدیدیت کے علم برداروں نے اپنے مخصوص افکار پر جس شد و مد کے ساتھ اصرار کیا اور ان کی تنفیذ کے لیے جس طرح طاقت اور حکومت کا بے دریغ استعمال ہوا اس نے فکری استبداد کی وہی صورتِ حال پیدا کر دی، جو عہدِ وسطٰی کے یورپ میں مذہبی روایت پسندی نے پیدا کی تھی اور جس کے ردِّعمل میں جدیدیت کی تحریک برپا ہوئی تھی۔ اس استبداد کا لازمی نتیجہ شدید ردِّعمل کی شکل میں رونما ہوا۔ اور یہی ردِّعمل مابعد جدیدیت (Post modernism) کہلاتا ہے۔

مابعد جدیدیت ان افکار کے مجموعے کا نام ہے جو جدیدیت کے بعد اور اکثر اس کے ردِّعمل میں ظہور پذیر ہوئے۔ اس کے علَم بردار نہ تو کسی منظم نظامِ فکر کے قائل ہیں اور نہ منظم تحریکوں کے۔ اس لیے یہ فکر اشتراکیت یا جدیدیت کی طرح کوئی مبسوط یا منظم فکر نہیں ہے۔ اور نہ اس کی پشت پر کوئی منظم تحریک ہی موجود ہے۔ بلکہ مابعد جدیدیت کے علَم بردار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کسی نظریے کا نام نہیں ہے، بلکہ اُس عہد کا نام ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں اور اُن کیفیتوں کا نام ہے جو اس عہد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔[۱۱] ظاہر ہے کہ یہ محض دعویٰ ہے اور چونکہ وہ اپنے خیالات کی تائید میں کتابیں لکھ رہے ہیں، فلسفیانہ مباحث چھیڑ رہے ہیں اور بحثیں کر رہے ہیں، اس لیے دُنیا اُن کے خیالات کو ایک آئیڈیالوجی ماننے پر

مجبور ہے۔

اکثر امور میں مابعد جدیدیت کے مفکروں میں اتفاقِ رائے بھی نہیں ہے اور علمی حلقوں میں یہ اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال ہوتی رہی ہے۔ اس لیے اس کی تعریف بیان کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ تاہم بعض مابعدالطبیعیاتی خیالات مفکرین میں مشترک بھی ہیں اور یہی مشترک فکر ان کا امتیاز ہے۔ لیوٹارڈ، جس کا اس فکر کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے، اس نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

I define Postmodernism as incredulity towards mega-narratives.[12]

(میرے نزدیک مابعد جدیدیت کا مطلب عظیم بیانات پر عدم یقین ہے۔)

مابعد جدیدیت کے حامی کہتے ہیں کہ جدیدیت نے عقل کی بالادستی، آزادی، جمہوریت، ترقی، کھلی منڈی اور اشتراکیت جیسے خیالات عالم گیر سچائیوں کی حیثیت سے پیش کیے۔ یہ ایک کھلا فریب تھا۔ زمانہ کے امتداد نے ان ساری خود ساختہ حقیقتوں کا جھوٹ واضح کر دیا ہے، اس لیے اب اس عہد میں اس طرح کے عظیم بیانات (Meganarratives) نہیں چلیں گے۔ یہ اس عہد کا خاصہ ہے۔ اس میں جدیدیت کے تمام دعووں کی عمارت ڈھا دی گئی ہے۔ اور اس عہد کی یہ خصوصیت ہی مابعد جدیدیت ہے۔[۱۳]

سچائی کی اضافیت کا نظریہ

مابعد جدیدیت کے تصور کے مطابق دُنیا میں کسی آفاقی سچائی کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ آفاقی سچائی کا تصور ان کے نزدیک محض ایک خیالی تصور (Utopia) ہے۔ جدیدیت کے علَم برداروں کا خیال ہے کہ جمہوریت، آزادی و مساوات، سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت (یا اشتراکیوں کے نزدیک اشتراکیت) اور ٹیکنالوجیکل ترقی وغیرہ پر مبنی جو ماڈل یورپ میں اختیار کیا گیا، اس کی حیثیت ایک عالمی سچائی کی ہے اور ساری دُنیا کو اپنی روایات چھوڑ کر ان عالمی

سچائیوں کو قبول کرنا چاہیے۔ چنانچہ ۲۰ ویں صدی میں ساری دُنیا کو اپنی روایات چھوڑ کر ان عالمی سچائیوں کو قبول کرنا چاہیے۔ چنانچہ ۲۰ ویں صدی میں ساری دُنیا کو جدید بنانے کا کام شروع ہوا۔ روایتی معاشروں سے کہا گیا کہ وہ صنعتیں قائم کریں، شہر بسائیں، آزادی کی قدروں کو نافذ کریں، جمہوری طرزِ حکومت اپنائیں، جدید ٹیکنالوجی کو اختیار کریں اور اس طرح جدید بنیں کہ فلاح و ترقی کا یہی واحد راستہ ہے۔ مابعد جدید دوسری انتہا پر جا کر عالمی یا آفاقی سچائی کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک چاہے سچائی ہو یا کوئی اخلاقی قدر، حسن و خوبصورتی کا احساس ہو یا کوئی ذوق، یہ سب اضافی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا تعلق انفرادی پسند و ناپسند اور حالات سے ہے۔ یعنی ایک ہی بات کسی مخصوص مقام پر یا مخصوص صورتوں میں سچ اور دوسری صورتوں میں جھوٹ ہوسکتی ہے۔ دُنیا میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ہمیشہ اور ہر مقام پر سچ ہو۔ تصورِ جہاں (World view) سچائی کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ طاقت کی لڑائی میں محض ایک ہتھیار ہوتا ہے۔ لوگوں نے دُنیا پر حکومت کرنے اور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے اپنے من پسند خیالات کو عالم گیر سچائیوں کے طور پر ان پر مسلط کیا ہے۔ اس طرح وہ سرمایہ داری، جمہوریت اور اشتراکیت وغیرہ جیسے نظریات کے سخت ناقد ہیں، جو اپنے خیالات کو عالم گیر سچائی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مذہبی عقائد اور تصورات کے بھی منکر ہیں کیونکہ مذاہب کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ان کے معتقدات کی حیثیت اٹل حقائق کی ہے۔[۱۴]

اس نظریے کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہے کہ صدیوں کی علمی جستجو کے باوجود انسانی ذہن کسی ایک سچائی پر متفق نہیں ہو سکا۔ آج بھی صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے اطراف کئی ایک اور بسا اوقات باہم متضاد سچائیاں (یعنی سچ کے دعوے) پائی جاتی ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم سچائی سے متعلق اپنے نقطۂ نظر ہی کو بدل لیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ سچائی نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ سچائی محض ہمارے مشاہدے کا نتیجہ ہوتی ہے اور مشاہدہ ہمارے ذہن کی تخلیق۔ سچائی کی تلاش نہیں، بلکہ سچائی کی تشکیل ہوتی ہے۔ حالات کے مطابق ہمارا

ذہن سچائی کی تخلیق کرتا ہے اور چونکہ بیک وقت ایسی کئی تخلیقات ممکن ہیں، اس لیے یہ ماننا چاہیے کہ کوئی بھی تخلیق حتمی نہیں ہے۔

مابعد جدیدیت کے ماننے والے سائنس کو بھی حتمی سچائی کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لیونارڈ لکھتا ہے کہ سائنس کی زبان اور اخلاقیات، اور سیاسیات کی زبان میں گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق ہی مغرب کے تہذیبی تناظر کی تشکیل کرتا ہے۔[۱۵]

یعنی سائنس بھی مغرب کی سیاست اور اخلاقی فلسفوں سے آزاد نہیں ہے۔

دُنیا کے غیر حقیقی ہونے کا نظریہ

مابعد جدیدیت کے مطابق جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس کی حیثیت سچائی کی نہیں ہے۔ اس کے علم برداروں کا خیال ہے کہ ہم وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں اور ہم وہی دیکھتے ہیں جو مخصوص وقت اور مخصوص مقام پر مخصوص احوال خود کو دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ دُنیا کو حقیقی اور ٹھوس اشیا اور مناظر کی بجائے ایسے عکسوں (Images) اور مظاہر (representations) سے عبارت سمجھتے ہیں جو غیر حقیقی (unreal) اور غیر محسوس (untangible) ہیں۔[۱۶] یعنی پوسٹ ماڈرن ازم کے نزدیک یہ دُنیا محض ایک ویڈیو گیم ہے جس میں ہم اپنی پسند کی سچائیاں دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ ضیاء الدین سردار نے اس کی تشریح یوں کی ہے:

اس کا مطلب ہے کہ یہ دُنیا ایک ایسا تھیٹر ہے جس میں ہر چیز مصنوعی طور پر تشکیل کردہ ہے۔ سیاست عوامی استعمال کے لیے کھیلا جانے والا ایک ڈراما ہے۔ ٹیلی ویژن پر دستاویزی فلمیں تفریحات کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ صحافت، حقیقت اور افسانے کے بیچ فرق کو دھندلا دیتی ہے۔ زندہ افراد، سوپ اوپیرا کے کردار بن جاتے ہیں اور افسانوی کردار زندہ انسانوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ہر چیز اچانک واقع ہوتی ہے اور ہر شخص عالمی تھیٹر میں واقع ہونے والی ہر چیز کا برموقع نظارہ کرتا ہے۔[۱۷]

ردِّ تشکیل کا نظریہ

جیسا کہ عرض کیا گیا، مابعد جدیدیت کے نزدیک جمہوریت، ترقی، آزادی، مذہب، خدا، اشتراکیت اور اس طرح کے دعوؤں کی وہی حیثیت ہے جو دیومالائی داستانوں اور عقیدوں کی ہے۔ اس لیے انھوں نے ان تمام دعوؤں کو عظیم بیانوں (meganarratives) کا نام دیا ہے۔ جدیدیت کے مفکرین کا خیال ہے کہ انھوں نے بہت سی 'سچائیاں' تشکیل دی ہیں اور چاہے مذاہب ہوں یا جدید نظریات، ان کی بنیاد خود ساختہ عالمی سچائیوں پر ہے، اس لیے جدیدیت کی دور کی تہذیب، علم وغیرہ انھی مفروضہ سچائیوں پر استوار ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان تشکیل شدہ سچائیوں کی ردّ تشکیل (deconstruction) کی جائے، یعنی انھیں ڈھایا جائے۔ چنانچہ ادب، فنونِ لطیفہ، آرٹ، سماجی اصول و ضابطے ہر جگہ ان کے نزدیک کچھ خود ساختہ سچائیاں اور عظیم بیانیے ہیں جن کی ردِّ تشکیل ضروری ہے تاکہ مابعد جدیدی ادب فنونِ لطیفہ وغیرہ میں ایک 'غلط مفروضوں' کا عمل دخل نہ ہو۔ جیسا کہ مابعد جدیدیت کا ایک تجزیہ نگار لکھتا ہے:

> مابعد جدید مفکرین کا خیال ہے کہ ہماری طرح کے ایک آفاقی اور غیر مرکزی سماج میں خود بخود مابعد جدید کی طرح کے ردِّ عمل جنم لیتے ہیں۔ یعنی عظیم بیانات کے فکری استبداد کا استرداد، ساخت اور طرز کی وحدت کے روایتی سانچوں کی شکست و ریخت اور منطق کی مرکزیت اور اس طرح کے دیگر مصنوعی طور پر مسلط کردہ نظاموں کو اُٹھا کر پھینک دینے کا عمل۔[۱۸]

شاید بحث پیچیدہ اور فلسفیانہ ہوگئی۔ لیکن چونکہ اس فکر کی بنیادیں فلسفیانہ ہیں، اس لیے اس مختصر فلسفیانہ بحث کے بغیر اس نظریے پر کماحقہ روشنی نہیں ڈالی جاسکتی تھی۔

مابعد جدیدیت کے عملی اثرات

مابعد جدیدیت ایک دقیق فلسفیانہ بحث ہے۔ لیکن اس کے پیش رَو، جدیدیت کے

افکار بھی ایسے دقیق فلسفے تھے۔ عام لوگ ان گہرے فلسفوں کا مطالعہ نہیں کرتے لیکن عملی زندگی میں ان کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بھی سب لوگ والٹیر اور روسو کی دقیق کتابیں نہیں پڑھتے تھے، لیکن آزادی، مساوات، جمہوریت، اپنے حقوق کا احساس، مساوات مرد و زن، روایات کے خلاف بغاوت اور عقل پر اصرار جیسی چیزیں عام آدمی کے رویوں کا بھی حصہ تھیں۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے عہد میں بھی عام لوگ چاہے مابعد جدیدیت کی اصطلاحات اور بحثوں سے واقف نہ ہوں، لیکن محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اپنی عملی زندگی اور رویوں میں اس کے اثرات قبول کر رہے ہیں۔ مسلمان اور بعض اوقات اسلام کے فروغ کے لیے کام کرنے والے صاحبان بھی اس کے اثرات سے خود کو نہیں بچا پا رہے ہیں۔

مابعد جدیدیت کا سب سے نمایاں اثر یہ ہے کہ افکار، نظریات اور آئیڈیالوجی سے لوگوں کی دلچسپی نہایت کم ہوگئی ہے۔ عہدِ جدید کا انسان مخصوص افکار و نظریات سے وفاداری رکھتا تھا اور ان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے پُر جوش و سرگرم رہتا تھا۔ مابعد جدید دَور کے انسان کے نہ کوئی آدرش ہیں نہ اصول۔ اس کے سامنے کسی بھی موضوع پر نظری بحث شروع کیجیے، دامن جھاڑ کر اُٹھ جائے گا۔ اس لیے بعض مفکرین نے اس عہد کو 'عدم نظریہ کا عہد' Age of no ideology قرار دیا ہے۔[۱۹] اصول اور افکار کے مبسوط نظام (doctrine) کے بالمقابل مابعد جدید انسان کے پاس صرف جذبات و احساسات ہیں یا عملی مسائل (pragmatic issues)۔ مابعد جدیدیت کا کہنا ہے کہ زندگی کی تمام بحثیں 'مسئلہ' اور 'حل' (problem and solution) تک محدود کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے اصولوں اور نظریوں کے بجائے ایک ایک مسئلے کو الگ الگ لیا جانا چاہیے اور اس کے حل پر بات ہونی چاہیے۔ چنانچہ مابعد جدیدی انسان کی بحث و گفت گو کا سارا زور یا تو روزمرہ کے عملی مسائل پر ہے یا روابط و تعلقات کی جذباتیت پر۔ مختلف فیہ اور متنازعہ فیہ مسائل میں وہ باہم متضاد خیالات میں سے ہر خیال کو بیک وقت درست سمجھتا ہے، ان کی تنقیح اور درست فیصلے سے اسے

کوئی دلچسپی نہیں۔

مذہبی معاملات میں وحدتِ ادیان کا نظریہ بہت قدیم ہے۔ مابعد جدیدیت نے اس طرزِ فکر کو تقویت دی ہے۔ اب دُنیا بھر میں لوگ بیک وقت سارے مذاہب کو سچ ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اور بین المذاہب مکالمات ومباحث سے لوگوں کی دلچسپی رُو بہ زوال ہے۔ جبکہ دوسری طرف الحاد و مذہب بیزاری کی شدت بھی ختم ہو رہی ہے۔ چونکہ الحاد بھی ایک 'دین' یا ایک 'دعویٰ' ہے، اس لیے مابعد جدید انسان اسے بھی ایک مسلک کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اس عہد کو لادینیت کے خاتمے کا عہد (Age of de-secularisation) بھی کہا جاتا ہے۔[۲۰] ایک شخص خدا پر یقین نہ رکھتے ہوئے بھی روحانی سکون کی تلاش میں کسی مذہبی پیشوا سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور آج اسے کسی ہندو بابا کے ہاں سکون ملتا ہے تو کل کوئی مسیحی راہب اسے مطمئن کر سکتا ہے۔ یہ مابعد جدیدیت ہے۔

قدروں کی اضافیت کے نظریے نے سماجی اداروں اور انضباطی عوامل (Regulating factors) کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ خاندانی نظام اور شادی بیاہ کے بندھنوں کا انکار ہے نہ اقرار۔ عفت، ازدوجی وفاداری اور شادی کے بندھن مابعد جدیدیوں کے ہاں 'عظیم بیانات' ہیں۔ اسی طرح جنسوں کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ رول کو بھی وہ آفاقی نہیں مانتے۔ نہ صرف مرد عورت کے درمیان تقسیمِ کار کے روایتی فارمولوں کے وہ منکر ہیں، بلکہ جنسی زندگی میں بھی مرد اور عورت کے جوڑے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ شادی مرد اور عورت کے درمیان بھی ہو سکتی ہے، اور مرد مرد اور عورت عورت کے درمیان بھی، کوئی چاہے تو اپنے آپ سے بھی کر سکتا ہے۔ مرد اور عورت شادی کے بغیر ایک ساتھ رہنا پسند کریں تو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ایک ساتھ بھی نہیں رہنا ہے تو صرف تکمیلِ خواہش کا معاہدہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب ذاتی پسند اور ذوق کی بات ہے۔ فیشن، لباس، طرزِ زندگی ہر معاملے میں کوئی بھی ضابطہ بندی گوارا نہیں ہے۔ مرد بال بڑھا سکتا ہے، چوٹی رکھ سکتا ہے، اسکرٹ پہن سکتا ہے، زنانہ نام رکھ سکتا ہے، کسی بھی رنگ اور ڈیزائن کا لباس پہن سکتا ہے۔ سوسائٹی کو کسی بھی رویے کو ناپسند

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مادر زاد برہنہ رہنا چاہے تو سوسائٹی اس پر بھی معترض نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ بعض مابعد جدیدی، لباس کو آفاقی ضرورت قرار دینے پر معترض ہیں۔ آدمی اگر موسم اور اپنے ذوق کی مناسبت سے کوئی لباس پسند کرنا چاہے تو کرے اور اگر عریاں رہنا چاہے تو انسانی جسم سے بڑھ کر خوبصورت لباس اور کیا ہوسکتا ہے؟ وہ عریانیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر اس طرزِ زندگی کے فروغ کے لیے ویب سائٹس، ہیلپ لائنز، ڈسکشن فورمز اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔

سیاسی محاذ پر مابعد جدیدی، قوموں کے وجود اور قوم پرستی کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک قوم، قومی مفاد، قومی تفاخر، قومی کردار، قومی فرائض، یہ سب 'عظیم بیانات' ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ضرورت اور مفاد کے مطابق افراد کسی بھی قسم کے دوسرے افراد سے تعامل کرتے ہیں اور اس طرح گروہوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ تشکیل ضروری نہیں کہ قوم اور نسل کی بنیادوں پر ہو۔ قوموں کے اقتدارِ اعلیٰ کا تصور بھی ان کے نزدیک 'عظیم بیان' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدی سماج میں ایک طرف گلوبلائزیشن کے عمل کے نتیجے میں ریاست کے اقتدار اعلیٰ کو عالمی معاشی قوتوں کے تابع کر دیا گیا اور دوسری طرف مقامی معاشروں کے مفادات کو بھی ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ پر فوقیت اور بالاتری دے دی گئی۔ اگر کوئی علاقہ، قبیلہ یا گروہ ریاست کے اقتدار سے خوش نہیں تو ریاست کو اس پر زبردستی کا کوئی حق نہیں۔[۲۱]

اس طرح پالیسی کی سطح پر 'ترقی' اور ٹیکنالوجی وغیرہ جیسے تصورات کو چیلنج کیا گیا۔ مابعد جدیدی ترقی کے 'یکساں فارمولے' کے مخالف ہیں۔ یہ بات کہ جدید شہروں کی شان و شوکت اور ٹیکنالوجی پر مبنی تعیشات پس ماندہ علاقوں کی منزل اور ان کی کاوشوں کا ہدف ہونا چاہیے، اب مسلمہ نہیں رہی۔ مابعد جدید تحریکوں نے دیہی زندگی اور روایتی معاشروں کی افادیت بھی اُجاگر کی۔ اگر لوگ اپنے قبائلی طرزِ زندگی سے مطمئن اور خوش ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ انھیں جدید شہری ترقی کے لیے مجبور کیا جائے۔ ان کے نزدیک جنگل کی آزاد فضا ہی سچائی ہے۔ دیہی لوگوں کو ان کی زمین سے ہٹا کر وہاں نئی صنعتیں قائم کرنے کا کوئی جواز نہیں

ہے، خواہ اس کے بدلے میں ان کو زیادہ آرام وہ زندگی ہی کیوں نہ میسر آئے۔ مابعد جدید پالیسی کا حاصل یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی مرضی اور پسند کی زندگی گزارنے کی آزادی دی جانی چاہیے اور تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی، ترقی یا تعیشات، کوئی بھی چیز اس پر مسلط نہیں کی جانی چاہیے۔

آرٹ اور فنونِ لطیفہ میں وہ ہر طرح کے نظم اور پابندی کے خلاف ہیں۔ جدیدیت نے ان محاذوں پر جو اصول تشکیل دیے تھے، مابعد جدیدی ان کی ردِّ تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں: ''ہر طرح کی نظریاتی ادّعایت سے گریز اور تخلیقی آزادی پر اصرار مابعد جدیدیت ہے۔'' [۲۲] مابعد جدیدی کہتے ہیں کہ ادب اور فنونِ لطیفہ حقیقت کی ترجمانی کے لیے نہیں بلکہ حقیقت کی تخلیق کے لیے ہیں۔ اس لیے وہ آرٹ کو ہر طرح کے ادبی، سیاسی اور مذہبی دعوؤں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔

اس طرح مابعد جدیدیت کی تحریک نے سوسائٹی میں ہر جگہ مقتدرہ افسر شاہی اور ضابطوں اور اصولوں کی سخت گیری کو چیلنج کیا۔ نظامِ مراتب (hierarchy) کے مقابلے میں انارکی، بندشوں کے مقابلہ میں آزادی، اختیارات کی مرکزیت (centralisation) کے مقابلہ میں غیر مرکزیت (decentralisation) اور ضابطے اور اصول کے مقابلے میں انفرادی پسند اور آزادی کے احترام وغیرہ اس تحریک کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس صورتِ حال نے منظم ہمہ گیر تحریکوں کے مقابلے میں ایشوز پر مبنی اور موضوعاتی تحریکیں، سخت گیر بیورو کریٹک انتظام کے مقابلے میں ڈھیلی ڈھالی قیادت وغیرہ کی کیفیتیں پیدا کیں۔ عملی زندگی کے مختلف معاملات میں مابعد جدیدی ہر طرح کی روایت، اصول اور ضوابط کی عالم گیری کے خلاف ہیں اور ذاتی پسند و ناپسند کو اہمیت دیتے ہیں۔ طرز ہائے زندگی سے متعلق معاملات میں ذاتی پسند افراد کی ہوتی ہے۔ اس کو منضبط کرنے کا معاشرے کو کوئی حق نہیں ہے اور اجتماعی معاملات میں پسند و ناپسند قبیلوں، آبادیوں، تنظیموں یا کسی بھی اجتماعی گروہ کی ہوسکتی ہے۔ اس پر کنٹرول کرنے کا کسی عالمی یا قومی ادارے کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

مابعد جدیدیت کا ایک محاکمہ

مابعد جدیدیوں کا یہ دعویٰ کہ دُنیا میں کسی سچائی کا سرے سے وجود نہیں ہے ایک نہایت غیر منطقی دعویٰ ہے۔ اس دعویٰ میں بہت بڑا ریاضیاتی نقص ہے۔ یہ کہنا کہ 'یہ سچ ہے کہ دُنیا میں کوئی سچ نہیں' ایک بے معنی بات ہے۔ ''دُنیا میں کوئی سچ نہیں ہے'' یہ بذاتِ خود ایک دعویٰ اور ایک بیان ہے۔ اگر اس بیان کو درست مان لیا جائے تو اس کی زد سب سے پہلے خود اسی بیان پر پڑے گی، اور یہ بیان جھوٹا قرار دیا جائے گا۔ یہ ماننے کے لیے کہ ''دُنیا میں کوئی سچ نہیں ہے'' کم سے کم اس ایک بات کو سچ ماننا پڑے گا۔

مابعد جدیدی ہر عالم گیر سچائی کے دعوے کو بڑا بول کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس پیمانے پر خود مابعد جدیدیت کو بڑا بول کیوں نہ قرار دیا جائے؟ خود ساختہ سچائیوں، کی ردّ تشکیل کی یہ فکر ایسا جال بچھاتی ہے کہ اس میں خود ہی پھنس جاتی ہے اور خود اپنے اصولوں کے ذریعے اپنے ہی اصولوں کا ردّ کرتی ہے۔ غالباً یہ انسان کی فکری تاریخ کا نہایت منفرد واقعہ ہے کہ کوئی فکر اپنے تشکیل کردہ پیمانوں سے اپنی ہی بنیادوں کو ڈھائے۔

منطقی تضاد کے علاوہ اس فکر کے عملی اثرات بھی نہایت بھیانک ہیں۔ اگر سچائی اضافی ہے اور دُنیا میں کوئی قدر آفاقی نہیں ہے اور سچائیاں مقامی تہذیبوں کی پیداوار ہیں تو سوال یہ ہے کہ کس بنیاد پر مثلاً نازی ازم کو غلط قرار دیا جائے گا؟ آخر نازی ازم بھی ایک قوم کے اتفاقِ رائے ہی کا نتیجہ تھا۔ یا مثلاً کس بنیاد پر ایک شخص کو دوسروں کی جیب کاٹنے سے روکا جائے گا؟ اس لیے کہ ہر جیب کترا جس مخصوص تہذیبی پس منظر میں پروان چڑھتا ہے وہ اسے جیب کترنے کے عمل کو ایک ناگزیر حقیقت کے روپ میں ہی دکھاتا ہے، یا اگر کوئی بزرگ افیم کھا کر چلتی ٹرین کے دروازہ میں سے یہ سمجھ کر نہایت صبر وسکون کے ساتھ باہر نکلنے کی کوشش کریں کہ وہ اپنے گھر کے چمن میں تشریف لے جا رہے ہیں تو آخر کس دلیل سے انہیں اس حماقت سے روکا جائے گا؟ وہ نہایت ایمان داری کے ساتھ وہی سچائی دیکھ رہے ہیں جو افیم

کے اثر سے پیدا شدہ ان کے 'مخصوص احوال' انھیں دکھا رہے ہیں۔ اس لیے تعددِ صداقت (Pluralism of truth) کے نظریے کا تقاضا ہے کہ ان کی اختیار کردہ سچائی کو بھی تسلیم کیا جائے۔ سچائی کی اضافیت کے نظریے کو مان لینے کے بعد اس دُنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کچھ حقائق پر عالمی اتفاقِ رائے نہ ہو اور انھیں قطعی حقائق کے طور پر قبول نہ کیا جائے، اُس وقت تک تمدن کی گاڑی ایک آنچ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جہاں کچھ باتوں پر اختلافِ رائے تمدن کو رنگا رنگی اور تنوع بخشتا ہے، وہیں کچھ باتوں پر اتفاق تمدن کو استحکام عطا کرتا ہے۔ اس لیے اختلاف اور اتفاق دونوں کی بیک وقت ضرورت ہے۔

مابعد جدیدیت اور اسلام

سچائی کی اضافیت کا نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک باطل نظریہ ہے۔ اسلام اس بات کا قائل ہے کہ عقلِ انسانی کے ذریعے مستنبط حقائق یقیناً اضافی ہیں اور شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہیں۔ اس حد تک مابعد جدیدیت اسلامی فکر سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک جن حقائق کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے وہ حتمی اور قطعی ہیں۔ ان کی جزوی تشریحات و تعبیرات (جس میں فہمِ انسانی اور عقلِ انسانی کا دخل ہے) تو اضافی ہوسکتی ہیں، ان کے واضح معنی ہر اعتبار سے حتمی اور قطعی ہیں۔

اس ساری بحث میں اسلام کا نقطۂ نظر نہایت معتدل، متوازن اور عقل کو اپیل کرنے والا ہے۔ اس نقطۂ نظر میں مابعد جدیدی مفکرین کے اُٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات بھی موجود ہیں اور اُن تضادات کی بھی گنجائش نہیں ہے جو مابعد جدیدیت میں پائے جاتے ہیں۔

یہ بات کہ انسانی عقل حتمی نہیں ہے اور بسا اوقات دھوکا کھا جاتی ہے، اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کوئی نئی فکر نہیں ہے۔ جدیدیت نے جس طرح عقلِ انسانی کو حتمی اور قطعی مقام دیا اور عقلیات کو حتمی سچائی کے طور پر پیش کیا، اس پر مابعد جدیدی مفکرین سے بہت پہلے اسلامی مفکرین نے جرح کی۔ بلکہ یہ مبحث صدیوں قبل امام غزالیؒ اور امام ابنِ تیمیہؒ

کے افکار میں بھی ملتا ہے۔

امام غزالیؒ نے تہافۃ الفلاسفہ میں ارسطو کی منطق پر خود اسی منطق کے اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے جو تنقید کی ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عقل کے ذریعے معلوم حقائق کو محض واہمہ قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات کی وسعتیں اور وقت لامحدود ہے اور انسانی عقل لامحدود کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کے مشاہدات اضافی ہیں اور ان مشاہدات کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج بھی اضافی ہیں۔[۲۳] اپنی کتاب ''معیار العلم'' میں اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے مختلف مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسانی حسیات کے ذریعے حاصل شدہ معلومات اکثر اوقات دھوکے کا باعث ہوتی ہیں۔ صرف آنکھ سے دیکھا جائے تو ستارے چھوٹے چھوٹے ذرات معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں سے کئی ستارے زمین اور سورج سے بھی بڑے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظر آنے والے حقائق بھی ضروری نہیں کہ حقائق ہوں۔ وہ محض حقیقت کا سایہ یا واہمہ ہو سکتے ہیں۔ حسیات کا دھوکا عقل سے معلوم ہوتا ہے اور عقل کا دھوکا کسی ایسے ذریعے سے معلوم ہوگا جو عقل سے بالاتر ہے (یعنی وحیِ الٰہی)۔[۲۴]

علّت و معلول کے سلسلے میں امام غزالیؒ اور ابن رُشدؒ کی بحث بھی پڑھنے کے لائق ہے۔[۲۵] ان کا نقطۂ نظر ہے کہ خالص عقلی طریقوں سے دُنیا یا انسان کے بارے میں کسی آفاقی بیان تک نہیں پہنچا جا سکتا، اس لیے کہ جو بیان بھی تشکیل دیا جائے گا وہ اپنے عہد کے مخصوص مادی پس منظر سے ماورا نہیں ہوگا۔ جو لوگ اس موضوع پر تفصیل سے پڑھنا چاہیں وہ خاص طور پر امام غزالیؒ کی تہافۃ الفلاسفہ اور معیار العلم کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

جدید اسلامی مفکرین نے بھی جدیدیت پر کلام کرتے ہوئے عقل کی تحدید اور عقل کے ذریعے معلوم حقائق کے اضافی ہونے کو ثابت کیا ہے۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ رقم طراز ہیں:

''انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر

لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی، اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا--- ان کے (علمی قیاسات) غلط ہونے کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر غلط ثابت نہیں ہوئے ہیں۔'' [۲۶]

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

یا

وہ علم، کم بصری جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علمِ حقیقی (یا حتمی اور قطعی سچائی) کا سرچشمہ باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس نے اپنے علم سے انسان کو اتنا ہی معمولی سا حصہ بخشا ہے جتنا وہ چاہتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ. (الِ عمران ۵:۳)

بیشک اللہ وہ ہے جس سے نہ زمین کی کوئی چیز مخفی ہے نہ آسمان کی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَآءَ. (البقرۃ ۲:۲۵۵)

جو کچھ ان کے سامنے ہے، اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ

بھی اس کے علم میں ہے اور لوگ اس کے علم میں کسی چیز پر بھی حاوی نہیں ہو سکتے بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔

اس طرح جو حقائق علمِ حقیقی کے سرچشمہ یعنی باری تعالیٰ کی جانب سے وحیِ الٰہی یا اس کے پیغمبر کی منصوص سنت کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ہوں وہ حتمی صداقت (absolute truth) ہیں اور ان کے ماسوا دُنیا میں حقیقت کے جتنے دعوے پائے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ اگر وہ وحیِ الٰہی سے متصادم ہیں تو وہ بالکل مطلق (absolute false) ہیں اور اگر متصادم نہیں ہیں تو ان کی حیثیت اضافی صداقت یا relative truth کی ہے جو صحیح بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی۔[۲۷]

اس بحث سے یہ بات واضح ہے کہ وحیِ الٰہی سے منصوص حقائق کے ماسوا تمام امور، خواہ وہ سائنسی اصول وضوابط ہوں یا ریاضی و منطقی، یا معاشیات و سیاسیات یا سماجیات و عمرانیات سے متعلق امور، تمام دعوے اضافی ہیں۔

عملی زندگی میں قانون سازی اور ضابطہ سازی کے معاملے میں بھی اسلام نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ جدیدیت کی طرح نہ وہ ہر ضابطے اور اصول کو آفاقی حیثیت دیتا ہے اور نہ مابعد جدیدیت کی طرح ہر آفاقی ضابطہ واصول سے انکار کرتا ہے۔ وحیِ الٰہی کی صورت میں وہ بنیادی اصولوں اور سمت کو آفاقی حیثیت دیتا ہے، ان اُصولوں کو زمان و مکان (Time and space) سے بالاتر یا ماورا قرار دیتا ہے اور ان آفاقی اصولوں کی روشنی میں مخصوص وقت، مخصوص مقام اور مخصوص احوال کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ بلکہ اجتہادی اور غیر منصوص احکام میں 'عرف' کا لحاظ رکھتا ہے۔ جسے مابعد جدیدی، تہذیبی اتفاقِ رائے (cultural consensus) کہتے ہیں۔

ضیاء الدین سردار نے اسلام کو مابعد جدیدیت کے مقابلے میں ماورائے جدیدیت (transmodernity) کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔[۲۸] بنیادی اصولوں (قرآن و سنت کی تعلیمات) سے گہری وابستگی کے ساتھ تغیر پذیر زمانے کے مطابق تبدیلیوں کو اختیار

کرنے کا عمل ماورائے جدیدیت ہے۔ اسلامی معاشروں میں ابدی قدروں سے وابستگی موجود ہے۔ اس لیے وہ جدید یا مابعد جدید نہیں ہیں اور چونکہ یہ قدریں حیات بخش ہیں اور ان کے اندر نہ صرف نئے زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے، اس لیے ان کی بنیاد پر قائم سماج کو ماقبل جدید (Premodern) یا روایت پرست بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وحیِ الٰہی کی بنیادوں پر چند آفاقی قدروں اور اصولوں کی حتمیت اور ان کے دائرے کے باہر وسیع تر معاملات میں وحیِ الٰہی کی روشنی میں نئے طریقوں، ضابطوں اور راستوں کی تشکیل کا راستہ ایک ایسا معتدل راستہ ہے جو اسلام کو بیک وقت دائمی، آفاقی، تغیر پذیر اور مقامی احوال کے مطابق بناتا ہے اور زمان و مکان کے اختلافات سے ماورا کر دیتا ہے۔ اس لیے اسلام کی بنیاد پر صحیح طور پر بننے والا معاشرہ ماورائے جدید (Transmodern) معاشرہ ہوتا ہے۔

ختمِ نبوت کا نظریہ یعنی یہ عقیدہ کہ آنحضرتؐ کے بعد اب قیامت تک کوئی نبی مبعوث ہونے والا نہیں ہے اور وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب قیامت تک قرآن ہی اللہ کی کتاب اور بنی نوع انسان کی ہدایت کا ذریعہ ہے، اسلام کا ایک بنیادی نظریہ ہے۔ اس نظریے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اب زمانے میں کسی ایسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے جو بنیادی اصولوں میں کسی ترمیم کی متقاضی ہو۔ آنے والی ہر جدت کی نوعیت جزوی اور ذیلی ہی ہوگی۔ اس لیے یہ کہنا کہ اب ہم جدیدیت کے عہد میں ہیں، اس لیے ماقبل جدیدیت کی ہر چیز تبدیل ہونی ہے یا یہ کہ اب ہم مابعد جدیدیت کے عہد میں ہیں، اس لیے جدیدیت کی ہر جڑ کی ردّ تشکیل ضروری ہے، ایک نہایت لغو بات ہے۔ انسانی حیات میں بیک وقت دائمی اور تغیر پذیر دونوں طرح کے عناصر کارفرما ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے اس مسئلے پر اپنی تحریر 'دین حق' میں بہت دلچسپ اور دل نشین انداز میں بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''کیا یہ واقعہ نہیں کہ تمام جغرافیائی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود وہ قوانینِ طبعی یکساں ہیں جن کے تحت انسان دُنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ نظامِ جسمانی یکساں ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، وہ خصوصیات یکساں ہیں جن کی بنا پر ...

سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے۔ وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں ہیں جو انسان کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں۔ وہ قوتیں یکساں ہیں جن کے مجموعے کو ہم نفسِ انسانی کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ تمام طبعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی، معاشی عوامل بھی یکساں ہیں جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے تو جو اصول انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے صحیح ہوں، ان کو عالم گیر ہونا چاہیے۔" [۲۹]

بعینہٖ یہی بات زمانی اختلافات کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے:

زمانہ ایک حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

مابعد جدیدیت اور فروغِ اسلام

مابعد جدیدیت کا نظریۂ اسلام اور اسلامی تحریک کے لیے بیک وقت چیلنج کی بھی حیثیت رکھتا ہے اور امکان (opportunity) کی بھی۔ جدیدیت کی طرح اس تحریک نے بھی بعض سنجیدہ نظریاتی مسائل کھڑے کیے ہیں جن سے مسلمانوں کو فکری سطح پر نبرد آزما ہونا ہے۔ جدیدیت کے زمانے میں مفکرینِ اسلام نے اس کے اُٹھائے ہوئے سوالات کے مسکت جواب دیے تھے، لیکن ساتھ ہی جدیدیت نے جو حالات اور رویے پیدا کیے تھے، تحریکِ اسلامی نے اپنی حکمتِ عملی میں ان کا لحاظ بھی کیا تھا۔ جدیدیت نے عقل کو اہمیت دینے کا مزاج بنایا تھا تو تحریک نے عقلی طریقوں سے اسلام کی دعوت پیش کی تھی۔ تحریک کی صورت گری اور اس کے لیے بنائی گئی جماعت کے ڈھانچے کی تشکیل میں بھی جائز حدود میں جدید طریقوں کا استعمال کیا گیا تھا۔

ٹھیک یہی ردِ عمل مابعد جدیدیت کے بارے میں بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف ان فکری چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے جو مابعد جدیدیت نے پیش کیے ہیں اور دوسری طرف اسلام کی دعوت، اس کے مباحث اور طریقِ کار میں ان کیفیتوں، مزاجوں اور

رویوں کا لحاظ رکھنا ہے جو مابعد جدیدیت نے پیدا کیے ہیں۔

اسی پس منظر میں مسلمان مفکرین اور اسلام کے فروغ اور غلبے کے لیے کام کرنے والے درج ذیل نکات کے حوالے سے لائحۂ عمل بنا سکتے ہیں۔ یہ حرفِ آخر نہیں، ان پر گفتگو ہو سکتی ہے، بلکہ ہونا چاہیے۔

۱۔تحریکِ اسلامی کا مقابلہ آج بھی جدیدیت کے فلسفوں سے ہے۔ مابعد جدیدیت کی طاقت ورتحریک کے باوجود اب بھی عقلیت کا فریب پوری طرح بے نقاب نہیں ہو پایا ہے۔ سیاسی سطح پر عالمی استعماری قوتیں اسلامی قوتوں کی اصل حریف ہیں اور وہ آج بھی جدیدیت ہی کی مظہر ہیں۔ اسلامی دُنیا میں اسلامی تحریکوں کو کچلنے والے تمام حکمران جدیدیت کے منصوبے ہی کے عَلَم بردار ہیں۔ اس تناظر میں مابعد جدیدی ہمارے اہم حلیف ثابت ہو سکتے ہیں۔ مابعد جدیدی مفکرین مغرب اور مغربی تہذیب کی شان و شوکت، سرمایہ دارانہ معیشت کی چکاچوند اور مغربی افکار اور عقلیت کے سحر کو توڑنے میں ہمارے معاون بن سکتے ہیں۔تحریکِ اسلامی کو بڑا چیلنج اُن قوتوں سے درپیش ہے، جوتحریک کو رجعت پسندی قرار دیتے ہیں اور اسلام کے مقابلے میں جمہوریت، مرد و زن کی مساوات وغیرہ کے مغربی تصورات کو اسلامی معاشروں کے لیے راہِ نجات قرار دیتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے عَلَم بردار بڑے زور و شور سے ان 'عظیم بیانات' کی ردِتشکیل میں مصروف ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں یہ ہمارے حلیف ثابت ہو سکتے ہیں۔ مابعد جدیدی مفکرین نے جدید مغرب کے 'عظیم' بیانات پر جو سوالات کھڑے کیے ہیں، ہمیں ان کا مؤثر استعمال کرنا چاہیے اور جدیدیت اور جدید مغرب کو شکست دینی چاہیے۔

۲۔ مابعد جدیدیت نے روحانیت اور روایات (traditions) کا احیا کیا ہے اور مذہب کی طرف واپسی کی راہیں ہموار کی ہیں۔ اگرچہ مابعد جدیدی مذہب کو آفاقی سچائی کا مقام دینے کے لیے تیار نہیں، لیکن اگر روحانی سکون کے لیے کوئی شخص مذہب اختیار کرتا ہے یا کوئی معاشرہ اپنے لیے مذہبی قانون پسند کرتا ہے تو مابعد جدیدی مفکرین اسے قابلِ اعتراض

نہیں سمجھتے۔ یہ صورتِ حال بھی تحریک کے لیے سازگار ہے۔

۳۔ اس وقت دُنیا بھر میں تکثیری معاشرے (pluralistic societies) وجود میں آ رہے ہیں۔ ان معاشروں میں اہلِ اسلام کے لیے ایک بڑا مسئلہ اپنی اسلامی شناخت اور تشخص کے تحفظ کا ہے۔ مابعد جدیدی افکار یہاں بھی تحریک کے لیے معاون بنتے ہیں۔ مثلاً یکساں سول کوڈ کا تصور جدیدیت کا تصور ہے، جب کہ مابعد جدیدی مفکرین کے نقطۂ نظر سے ایک ہی ملک میں اپنی اپنی پسند کے علاحدہ علاحدہ قوانین کی نہ صرف گنجائش ہے، بلکہ یہ تکثیریت قابلِ تحسین ہے۔ میرا خیال ہے کہ تحریکِ اسلامی مابعد جدیدیت کے علَم برداروں کو دوسری مذہبی اقلیتوں کے لیے اسلامی تعلیمات کے حق میں ہموار کر سکتی ہے جن کے مطابق ہر مذہبی گروہ کو اپنے مذہبی قوانین کے مطابق اپنے معاملات چلانے کا حق حاصل رہتا ہے۔

۴۔ مابعد جدید مفکرین کے ساتھ اس تال میل کے ذریعے، تحریکِ اسلامی کو سچائی اور قدروں کی اضافیت کے نظریے کو پُرزور طریقے سے چیلنج کرنا چاہیے۔ ان مفکرین کے اُٹھائے ہوئے سوالات پر اسلام کا متوازن موقف گزشتہ سطور میں واضح کیا جا چکا ہے۔ یہ موقف مابعد جدیدیت کے اندرونی تضاد سے بھی پاک ہے اور جدیدیت کی ان الجھنوں کو بھی نہایت خوبصورتی سے حل کرتا ہے جن کے حل کے لیے مابعد جدیدیت کی تحریک برپا ہوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ موقف پُرزور طریقے سے دُنیا کے سامنے لایا جائے۔

۵۔ اس وقت دُنیا بھر کے مذہبی اور نظریاتی فلسفے اپنے پیغام اور طرزِ پیش کش کو مابعد جدید ذہن کے حسبِ حال بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیتھولک چرچ نے تو اس کی باقاعدہ منظم کوشش شروع کی ہے۔ اور عیسائی مطالعات میں Postmodern Evangelism باقاعدہ ایک ڈسپلن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔[۳۰] مارکسزم کی نئی پیش کش نیو مارکسزم کی صورت میں سامنے آ رہی ہے۔ اسلام کے داعیوں کو بھی اپنی پیش کش میں بدلے ہوئے ذہن کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

ابھی تک ہمارا مخاطب جدید دور کا وہ قاری تھا جس کے اپنے نظریات اور خیالات

تھے۔ ہمارا ہدف یہ تھا کہ اس کے نظریات اور خیالات کو غلط ثابت کیا جائے اور اس کے مقابلے میں اپنی دعوت کی معقولیت ثابت کی جائے۔ اب ہمارا سامنا ایک ایسے ذہن سے ہے جو کسی نظریے اور خیال کی ضرورت کا ہی قائل نہیں ہے۔ وہ بیک وقت ہماری دعوت اور ہمارے مخالف کی دعوت دونوں کو صحیح اور دونوں کو غلط سمجھتا ہے۔ وہ نظریہ اور فکر کے معاملے میں سنجیدہ ہی نہیں ہے۔ وہ مذہب کے ساتھ ساتھ فکر اور نظریے کو بھی انسان کا انفرادی معاملہ سمجھتا ہے جس پر بحث کرنے اور لڑنے کی کوئی ضرورت ہے نہ جواز۔ یہ بدلی ہوئی صورتِ حال علمی و فکری مباحث کے پورے منظرنامے کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اور اس کا لحاظ کیے بغیر ہم اپنی حکمتِ عملی کا صحیح طور پر تعین نہیں کر سکتے۔

۶۔ مابعد جدیدیت نے معقولیات اور علمی دلائل کی اہمیت اس قدر گھٹا دی ہے کہ فلسفہ، سماجیات، تہذیبی مطالعات وغیرہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے بالکل نئے طریقے وجود میں آ چکے ہیں۔ معقولات کے مقابلے میں ہلکی پھلکی اپیلیں مابعد جدید ذہن سے زیادہ قریب ہیں۔ ہمیں اپنی دعوت کی پیش کش میں اس تبدیلی کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا اور ایسے مطالعات تیار کرنے ہوں گے جن کے مقدمات مابعد جدید ذہن کو اپیل کر سکیں۔

۷۔ معلومات اور اطلاعات کی اُس غیر معمولی اہمیت کا جسے مابعد جدید عہد میں طاقت کے سب سے بڑے سرچشمے کا مقام مل چکا ہے، تقاضا ہے کہ تحریکِ اسلامی اس محاذ پر توجہ دے۔ کہا جا رہا ہے کہ مابعد جدید دَور میں سب سے بڑی قوت معلومات کی قوت ہی ہے۔ لیونارڈ نے لسانی کھیلوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ نئے دَور میں معلومات کی ہر چال طاقت کی ایک وضع کی حامل ہے۔[۳۱] اور بین ملکی طاقت کے کھیل میں کمپیوٹرائزڈ معلومات کا بڑا حصہ ہوگا۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ قوموں اور ملکوں کی آیندہ رقابتیں اور دشمنیاں معلومات کے ذخیروں پر قدرت حاصل کرنے کے لیے ہوں گی یعنی معلومات گیری ملک گیری کی طرح عالمی سطح پر ہوس کا درجہ اختیار کر لے گی۔[۳۲]

اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے کہ تقریباً ہر ملک اپنی معلوماتی پالیسی

(Knowledge Policy) وضع کر رہا ہے اور معلومات کے انتظام (Information Management) کو غیر معمولی اہمیت دے رہا ہے۔ اس تناظر میں تحریک اسلامی بھی معلومات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ اسے معلومات اور ڈاٹا (data) کے جمع و انتظام اور استعمال پر خصوصی توجہ دینی ہوگی اور اپنی معلوماتی پالیسی وضع کرنی ہوگی۔

۸۔ جہاں تک تحریک کے جماعتی ڈھانچے کا سوال ہے مابعد جدیدیت کے بعض طالب علموں کا خیال ہے کہ یہ جدید دَور کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دیا گیا ہے اور مابعد جدیدی عہد کی کیفیتوں کا ساتھ دینے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔ یہ ایک انتہاپسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ دُنیا بھر میں بڑی بڑی تنظیمیں مخصوص نظم جماعت کے ساتھ کامیابی سے کام کر رہی ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لیے ہمارے تنظیمی ڈھانچے میں بعض بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ علم انتظامیات (Management Sciences) کے تصورات میں مابعد جدیدی افکار نے بڑی انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔ مرکزیت، طاقت کا ارتکاز، سرخ فیتہ شاہی، ضابطوں کی سخت گیری، فیصلہ سازی اور مشاورت کے عمل کی مخصوص اداروں تک محدودیت، جواب دہی اور باز پرس کی میکانیت وغیرہ جیسے امور، جو نوآبادیاتی علمِ انتظامیات کی نمایاں خصوصیات تھیں، اب دُنیا بھر میں ردّ کی جارہی ہیں۔ اور مابعد جدید ذہن نہ انھیں قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، نہ اس سیٹ اَپ میں کام کرنے کے لیے۔ تحریکِ اسلامی کو اس تبدیلی پر بھی توجہ دینا ہوگی۔

خلاصۂ بحث

مابعد جدیدیت، جدیدیت کا ایک منفی ردّعمل ہے اور اس گھٹاٹوپ اندھیرے کا مظہر ہے جس میں مسلسل کئی نظریات کی ناکامی اور ابطال کے بعد ہمارے عہد کا پڑھا لکھا انسان بھٹک رہا ہے۔ افکار، نظریات، اور فلسفوں کی عالی شان عمارتیں اس بُری طرح سے زمین بوس ہوگئیں کہ نئے زمانہ کے فلسفیوں نے عافیت اسی میں محسوس کی کہ سوچنا ہی چھوڑ دیا

جائے۔فکر و خیال اور سچائی کے تصورات ہی کو واہمہ قرار دیا جائے۔نظریے اور آئیڈیالوجی کو ایک ناپسندیدہ شے باور کیا جائے اور حیاتِ انسانی کو حالات اور افراتفری کے حوالے کر کے مابعد جدیدیت کی جنت میں چین کی بانسری بجائی جائے۔تمام جھوٹے خداؤں کے زمین بوس ہو جانے کے بعد مابعد جدیدیت دراصل لا الٰہ کا اعلان ہے۔ اِلّا اللہ کا اعلان باقی ہے جو اِنْ شَاءاللہ موجودہ کیفیت کا لازمی اور منطقی انجام ہوگا۔

حواشی و مراجع

[1] Nasr Seyyed Hossein (1993), A Young Muslim's Guide to the Modern World, Cambridge, Cambridge University Press, p.156.

[۲] بیکن کے افکار کے مطالعہ کے لیے دیکھئے اس کی کتاب:

Bacon Francis (1863) Novum Organum Tr. James Spedding, Robert Leslie Ellis, and Douglas Denon Health, Boston, Laggard and Thompson [As available in online library http://www.constitution.org/bacon/textnote.htm]

[۳] ڈیکارٹ کے خیالات کے لیے دیکھئے:

Descartes Rene (1983) Principles of Philosophy Translated by V.R. Miller and R.P. Miller. Dordrecht: D. Reide

[۴] تھامس ہوبس کے افکار کی تفصیل کے لیے دیکھئے اس کی کتاب:

Hobbes Thomas (2007) Leviathan online available at eBook@Adelaide, http://etext.library.adelaide.edu.au/h/hobbes/thomas/h681/ updated Mon Mar 12 20:24:47 2007

[5] Electronic Library http://elab.eserver.org/hfl0242.html

باب ششم:
فکرِ اسلامی

(1) فکرِ اسلامی کیا ہے؟

(2) فکرِ اسلامی کا معنی و مفہوم

(3) فکرِ اسلامی کے بنیادی مصادر

(4) اسلامی فکر کی اہمیت

(5) عصرِ حاضر میں فکرِ اسلامی کی ضرورت

خرم مرادؒ

فکرِ اسلامی کیا ہے؟

پیغامِ قرآنی کی ترجمانی، سید مودودیؒ کی زبانی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹) ہمارے دور کی ایک عہد آفریں اور عہد ساز شخصیت تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عنایت کی کہ انہوں نے اس کے بخشے ہوئے قلم سے ان گنت دلوں میں ہل چل مچائی، ذہنوں کو مسخر کیا، زندگیوں کا رخ بدلا، انہیں اللہ کی راہ پر لگایا اور یوں اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کی شہادت اور اقامت کے لیے جہاد کی ایک تحریک برپا کردی۔ ساتھ ہی ساتھ، انہوں نے نصف صدی کے لگ بھگ اللہ کی دی ہوئی قوت کی ہر رمق لگا کر اس تحریک کو 'مرحلہ بہ مرحلہ' ایسی زبردست مجاہدانہ عزیمت اور حکیمانہ بصیرت کے ساتھ چلایا کہ موجودہ دور میں غلبۂ دین کے کام کے لیے راستے کھل گئے، اور چلنے والوں کے لیے راہ نمائی کا بیش بہا سامان فراہم ہوگیا۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ہوگا جہاں غلبۂ اسلام کے لیے جدوجہد ہورہی ہو اور اس میں سیّد مودودی کے افکار و عمل کے نقوش اور خوشبو موجود نہ ہوں۔

ان کے قلم، ان کے افکار، ان کے عمل اور ان کی آواز میں اس بے پناہ زور و قوت اور حیرت انگیز اثر آفرینی کا راز کیا ہے؟ یہ، اور صرف یہ، کہ وہ پیغامِ قرآنی کے ترجمان تھے، جس کی تعلیم رب رحمٰن نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے انسان کو دی ہے۔ نہ ان کا پیغام نیا تھا، نہ ان کی فکر، نہ ان کی تحریک۔ جو بات نئی تھی، جس نے ان کی ترجمانیٔ قرآن کو دورِ حاضر کے لیے مطابق حال اور اثر انگیز بنادیا، وہ یہ تھی کہ انہوں نے قرآن کی تعلیمات کے اصل معانی کو زندہ کیا، ان میں نئے سرے سے روح پھونکی، ان کو کل کی زبان کے ساتھ آج کی زبان کے جام میں بھی پیش

کیا، دین اور زندگی میں انہیں وہی مقام دیا جو قرآن نے دیا تھا اور جس سے وہ ہٹ چکی تھیں، روزمرہ کی چلتی پھرتی زندگی کے ساتھ، پوری کی پوری زندگی کے ساتھ ان کا وہ تعلق قائم کیا جو قرآن کو مطلوب تھا اور جو کٹ چکا تھا، ان کے درمیان باہم وہ ربط و تناسب بحال کیا جو قرآن نے قائم کیا تھا اور جو درہم برہم ہو چکا تھا۔ یہی دراصل ان کا سب سے بڑا فکری کارنامہ ہے۔ اسی کا نام احیائے اسلام ہے۔

وہ خود کہتے ہیں:

''ہم اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اسلام کی ان تمام اصطلاحات میں پھر وہی معنی پیدا کریں جو فی الاصل ان کے اندر پنہاں تھے، اور کلمہ اسلام کے ماننے اور بولنے والے، اسے اس کے پورے معنی کے ساتھ نہ صرف مانیں اور بولیں، بلکہ اپنی پوری زندگی میں اسی شعور کا اظہار کریں۔'' (روداد جماعت اسلامی، سوم)

چونکہ ان کی فکر کوئی نئی فکر نہ تھی، عین ترجمان قرآن تھی، اس لیے انہوں نے انتہائی شدت کے ساتھ اس بات کا اہتمام کیا کہ ان کے افکار و آراء پر ''فکر مودودی'' کی چھاپ نہ لگے، ان کے گرد ''فکر مودودی'' کے نام سے کوئی مسلک نہ بننے پائے، ان کی تحریک امت مسلمہ میں ''مودودی جماعت یا فرقہ'' بن کر نہ رہ جائے اور ان کی جماعت میں شامل ہونے والا کوئی شخص قرآن و سنت کے ماسوا کسی کو، بشمول ان کے، معیارِ حق ماننے کا پابند نا ہو۔

۱۹۴۱ء میں جماعت کے بنتے ہی انہوں نے شدومد کے ساتھ تاکید کی: ''ارکانِ جماعت کو میں خداوند برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پر پیش نہ کرے۔ اسی طرح میرے ذاتی عمل کو بھی'' — (روداد جماعت اسلامی، اول)۔ اس ہدایت کی مزید وضاحت انہوں نے ایک سائل کو جواب دیتے ہوئے کی: ''جماعت اسلامی میں شامل رہنے یا نہ رہنے کے لیے میری تحریروں سے اتفاق ہرگز ضروری نہیں ہے۔ یہ بات میں نے اسی روز کہہ دی تھی، جس روز جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی۔'' (ماہنامہ ترجمان القرآن، ستمبر ۷۶ء، رسائل و مسائل، پنجم)۔ پھر، کسی بھی قسم کی غلط فہمی کے ہر امکان کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا: ''میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے نہ کسی دینی منصب کا دعویٰ کیا ہے، نہ اپنی ذات کی طرف دعوت دی ہے۔ اس لیے

میرے کوئی ''معتقدین'' ہیں ہی نہیں۔ میں اور میرے ساتھی صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے معتقدین ہیں، اور ہمارا تعلق صرف راہ خدا میں ہم سفری کا ہے۔''

(ترجمان القرآن، ستمبر ۵۵ء، رسائل و مسائل، چہارم)

اپنے نام پر کسی فکری و فقہی مسلک قائم نہ ہونے دینے کے لیے ان کا اہتمام بالکل بجا، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سیّد مودودی کی فکری خدمات ملت اسلامیہ کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سب کا احاطہ تو ممکن نہیں، لیکن جو خدمات بنیادی نوعیت کی ہیں انہیں ہم یہاں اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔

ان کی سب سے بڑی خدمت، اسلام کا فکری احیا ہے۔ اس کی قدر و قیمت سمجھنا ہو تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کیا بن چکا تھا۔ وہ خود ۱۹۳۸ء میں پٹھان کوٹ میں اَن پڑھ دیہاتیوں کے سامنے ایک بڑی عام فہم تمثیل کے ذریعے صورتِ حال کی بڑی جامع اور مؤثر تصویر کشی کرتے ہیں:

''یہ گھنٹا جو آپ کے سامنے لٹک رہا ہے — اس میں بہت سے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جب اس کو کوک [چابی] دی جاتی ہے تو سب پرزے اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔

اگر آپ اسے کوک نہ دیں تو یہ وقت نہیں بتائے گا۔ اگر آپ کوک دیں لیکن اس قاعدے کے مطابق نہ دیں جو کوک دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، تو یہ بند ہو جائے گا یا چلے گا بھی تو صحیح وقت نہ بتائے گا۔ اگر آپ اس کے بعض پرزے نکال لیں اور پھر کوک دیں، تو اس کوک سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر آپ اس کے بعض پرزوں کو نکال کر سنگر مشین کے پرزے لگا دیں اور پھر کوک دیں، تو یہ نہ وقت بتائے گا نہ کپڑا ہی سیے گا۔ اگر آپ اس کے سارے پرزے اس کے اندر ہی رہنے دیں لیکن ان کو کھول کر ایک دوسرے سے الگ کر دیں، تو کوک دینے سے کوئی پرزہ بھی حرکت نہ کرے گا —

اسلام کو اس گھنٹے پر قیاس کر لیجیے [دین کے عقائد و اخلاق کے اصول اور دنیا کی ہر چیز کے حقوق سے لے کر حکومت کرنے کے قوانین تک] یہ سب اسلام کے پرزے ہیں، اور ان کو گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک ایسی ترتیب سے ایک دوسرے کے ساتھ کسا گیا ہے کہ جونہی اس میں کوک دی جائے — دنیا پر خدائی قانون کا تسلط — مسلسل ظاہر ہونا شروع ہو جائے —

[لیکن اب] سارے پیچ ڈھیلے ہو گئے اور پرزہ پرزہ الگ ہو کر بکھر گیا— آپ نے اس گھڑی کے بہت سے پرزے نکال ڈالے اور ان کی جگہ کوئی صاحب سنگر مشین کا پرزہ پسند کر کے لے آئے، کسی صاحب کو آٹا پیسنے کی چکی کا کوئی پرزہ پسند آ گیا تو وہ اسے اُٹھا لائے۔ اب آپ مسلمان بھی ہیں اور بینک سے سودی کاروبار بھی چل رہا ہے— کفر کی وفادارانہ خدمت بھی ہو رہی ہے— غرض کوئی غیر اسلامی چیز ایسی نہیں رہی جسے ہمارے بھائی مسلمانوں نے لا لا کر اسلام کی اس گھڑی کے فریم میں ٹھونس نہ دیا ہو۔

یہ سب حرکتیں کرنے کے بعد اب آپ چاہتے ہیں کہ کوک دینے سے یہ گھڑی چلے— کاش میں آپ کی ہاں میں ہاں ملا سکتا، مگر میں کیا کروں— [جس حالت میں آپ اس وقت ہیں] عمر بھر کوک دیتے رہیے، گھڑی نہ چلتی ہے نہ چلے گی۔''

(خطبات، ص:۱۷۱-۱۷۸)

سیّد مودودی نے فکر کی سطح پر باہر سے لا کر ٹھونسے ہوئے پرزوں کو نکال باہر کیا، جن پرزوں کو، مثلاً معاملات، سیاست، جہاد وغیرہ کو مسلمانوں نے ذہناً و عملاً دین سے باہر کر دیا تھا انہیں دوبارہ فٹ کیا، ہر پرزے کو، مثلاً ظاہر و باطن اور اصول و فروع کو صحیح ترتیب سے صحیح مقام پر بحال کیا، خصوصاً اس کوک کو جو سارے گھنٹے کو چلاتی ہے، یعنی ایمان کو، اور جن پرزوں کا ربط ٹوٹ گیا تھا مثلاً ایمان اور عمل کا، ان کو دوبارہ جوڑا۔ اس ضمن میں:

۱۔ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر، انہوں نے ایمان حقیقی کی بازیافت کی، جو اللہ کے نزدیک قابل قبول ہو، اس کی جنت میں لے جائے، اور دنیا میں غلبہ و سربلندی اور خلافت ارضی کا مستحق بنائے۔ یہی ان کی زندگی بھر کی کوششوں کا محور تھا، اس لیے کہ یہی پیغام قرآنی کا خلاصہ ہے: اے ایمان لانے والو، ایمان لاؤ۔ (النساء،۴:۱۳۶)، انہوں نے موروثی اور رسمی ایمان کو، جس کا ربط زندگی سے کٹ چکا تھا، یا جسے زندگی کے کونے کھدرے میں رکھ دیا گیا تھا، ایک دفعہ پھر زندگی، پوری کی پوری زندگی کا مرکز بنا دیا، ایسا مرکز جس کے دائرے سے ایک انچ زندگی بھی باہر نہیں رہ سکتی، ورنہ وہ کفر کے مترادف ہوگی۔ انہوں نے ایمان کے عوض پوری ذات اور زندگی کا سودا چکانا سکھایا، ایسا سودا جس میں جان و مال کی ہر رمق اللہ کے ہاتھ بک جاتی ہے:

''ایمان کا اقرار کرنے کے بعد تمہیں یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ جان میری ہے، جسم میرا

ہے، مال میرا ہے، فلاں چیز میری ہے اور فلاں چیز میری ہے۔ دوسرے کو مالک کہنا، اور پھر اس کی چیز کو اپنی قرار دینا، بالکل ایک لغو بات ہے — تم اپنے ان ہاتھوں اور پاؤں کو بھی اس کی پسند کے خلاف ہلانے کا حق نہیں رکھتے، تم ان آنکھوں سے بھی اس کی مرضی کے خلاف دیکھنے کا کام نہیں کر سکتے، تم کو اس پیٹ میں بھی کوئی ایسی چیز ڈالنے کا حق نہیں ہے جو اس کی مرضی کے خلاف ہو، تمہیں ان زمینوں اور جانداروں پر بھی مالک کی منشا کے خلاف کوئی حق حاصل نہیں ہے —'' (خطبات، ص:۵۹) اسی طرح کلمہ پڑھتے ہی، اللہ کے کلام اور اس کے رسول کی سنت کے مقابلے میں ''آپ کو یہ کہنے کا حق ہی نہ رہا کہ میری رائے یہ ہے، یا دنیا کا دستور یہ ہے، خاندان کا رواج یہ ہے، یا فلاں حضرت یا فلاں بزرگ یہ فرماتے ہیں۔'' (خطبات، ص:۵۱)

ایمان کا عملی تقاضا ہے ''خدا کے مقابلے میں اپنی آزادی و خودمختاری سے دستبردار ہو جانا، اور اس کی بادشاہی و فرماں روائی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا۔'' چنانچہ سیّد مودودی کے نزدیک ''جو اپنے معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھے یا خدا کے سوا کسی اور کے سپرد کر دے وہ مسلمان نہیں ہے۔'' (خطبات، ص:۵۰)

سیّد مودودی نے ایمان کا حقیقی مفہوم ہی واضح نہیں کیا، انہوں نے ہر اس بت پر بھی ضرب کاری لگائی جو زندگی کے معاملات میں حاکم بن جاتا ہے، دل میں خدا بن کر بیٹھ جاتا ہے، اور ایمان کو غارت کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اپنا نفس، خاندان اور معاشرے کا رواج اور چلن اور دنیا کے لوگ، ان میں سے ہر ایک خدا ہے، اگر اللہ کے ماسوا اس کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ ''جو شخص مسلمان بننا چاہتا ہو اس کو سب سے پہلے ان تینوں بتوں کو توڑنا چاہیے — ان کی بندگی اصل شرک ہے۔ آپ نے پتھروں کے بت توڑ دیے، اینٹ اور چونے سے بنے ہوئے بت ڈھا دیے، مگر سینوں میں جو بت خانے بنے ہوئے ہیں ان کی طرف کم توجہ کی۔'' (خطبات، ص:۹۰) جس کی زندگی کا جو حصہ اور جو فعل خدا کے قانون کے خلاف اور ان تینوں کا مطیع ہو، وہ ''اسی قدر کفر میں مبتلا ہے۔ کوئی آدھا کافر ہے، کوئی چوتھائی کافر ہے، کسی میں دسواں حصہ کفر کا ہے اور کسی میں بیسواں۔'' (خطبات، ص:۸۲)

انہوں نے اس پر شدت کے ساتھ زور دیا کہ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے، اور حب الٰہی ایمان حقیقی کا اصل معیار ہے۔ ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت صرف ایسے

ایمان پر اٹھ سکتی ہے جب ''آدمی اپنی تمام ان وفاداریوں کو دریا برد کردے جو خدا کی وفاداری کے تابع نہ ہوں بلکہ اس کے مدمقابل بنی ہوئی ہوں، یا بن سکتی ہوں۔ اپنے دل میں سب سے بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائے اور ہر اس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے نہاں خانہ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلے میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔'' (اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات۔ص:۲۳۸،۲۳۹) یہی خلاصہ ہے ایمان کی بازیافت کا۔

۲- ایمان کو مرکز زندگی بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ عمل اس کا تقاضوں کے مطابق ہو، ایمان کے بیج سے پھوٹنے والی زندگی کی ہر شاخ، عمل صالح کے پھلوں، پھولوں، پتیوں سے لدی ہوئی ہو۔ اسی لیے قرآن مجید نے ایمان اور عمل صالح کا ذکر لازم وملزوم کے طور پر ساتھ ساتھ کیا۔ بدقسمتی سے تکفیر کے ابتدائی فتنوں کی وجہ سے جب ایمان کی قانونی تعریف پر زور دیا گیا، تو ایمان وعمل کے درمیان یہ رشتہ لاینفک ذہنوں میں مدھم یا مفقود ہوگیا، اور عمل میں انتہائی ضعیف۔ سید مودودی نے دوسرا کام یہ کیا کہ ان دونوں کا تعلق ایک دفعہ پھر استوار کیا۔

مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کیوں ہے، وہ یہ سوال بار بار اٹھاتے ہیں، اور ہر بار ایک ہی جواب دیتے ہیں: علم اور عمل کی وجہ سے۔ ''کافر بھی آدم کی اولاد ہے اور تم بھی۔ کافر بھی ایسا ہی انسان ہے جیسے تم ہو۔ وہ بھی تمہارے ہی جیسے ہاتھ پاؤں، آنکھ کان رکھتا ہے— اسی خدا نے اس کو بھی پیدا کیا ہے، جس نے تم کو پیدا کیا ہے— تمھیں کیوں جنت ملے گی اور وہ کیوں دوزخ میں ڈالا جائے گا؟'' اصل فرق نام کا نہیں، لباس کا نہیں، پیدایش کا نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ''ایسا ظلم تو کبھی نہیں کرسکتا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر— ایک بندے کو جنت میں بھیجے اور دوسرے کو دوزخ میں پہنچادے۔'' لہٰذا ''مسلمان کو کافر سے جدا کرنے والی صرف دو چیزیں ہیں: ایک علم، دوسری عمل۔'' (خطبات:۳۶،۳۷)

پھر وہ حقیقی ایمان کے لیے عمل کے ناگزیر ہونے پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں: کیا آپ کو اس پر ہنسی نہ آئے گی جو ''کسی حکیم سے نسخہ لکھوا کر لائے اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر گلے میں باندھ لے یا اسے پانی میں گھول کر پی جائے؟'' کیا آپ اسے پاگل خانے نہ بھجوائیں گے جو ''علم طب کی کوئی کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ جائے اور یہ خیال کرے کہ محض اس کتاب کو پڑھ لینے سے بیماری دور ہوجائے گی۔'' (خطبات،ص:۴۶) لیکن یہی ساری ستم ظریفیاں مسلمان اللہ کی

کتاب کے ساتھ کرتے ہیں۔اسی طرح ''اگر تم زبان سے روئی لحاف، روئی لحاف پکارنا شروع کردو، تو سردی لگنی بند نہ ہوگی — اگر تم صبح سے شام تک پانی پانی پکارتے رہو تو پیاس نہ بجھے گی۔ بس یہی حال کلمۂ طیبہ کا ہے۔'' چنانچہ اگر معنی ''دل میں اتریں، اور ان کے زور سے تمہارے خیالات، تمہارے اخلاق اور تمہارے اعمال نہ بدلیں، تو نرے الفاظ بول دینے سے کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔'' (خطبات، ص:۵۴-۵۵)

۳- ایمان کا مطالبہ ہے پوری زندگی میں خدا کی عبادت: یہی قرآن کی دعوت ہے۔ لیکن عبادت کا مفہوم مراسم عبودیت تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ سید مودودی نے عبادت کے معنی کو مراسم عبودیت کی سطح سے اٹھایا، اور جیسا قرآن کو مطلوب ہے، اسے زندگی کے تمام شعبوں اور انتہائی دنیوی کاموں تک پر محیط کردیا۔ اس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ وہ ستون بن گئے، جن پر صالح زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، یا وہ تنا جو ایمان کے بیج کو اعمال صالحہ کے ثمر بار درخت میں تبدیل کرتا ہے۔

کیسی حیرت کی بات ہے کہ جو لوگ ''رات دن خدا کا قانون توڑتے ہیں — اپنی زندگی کے معاملات میں خدا کے احکام کی پروا نہیں کرتے، ان کی نماز اور روزے اور تسبیح اور تلاوتِ قرآن کو آپ خدا کی عبادت سمجھتے ہیں۔'' حالانکہ عبادت کچھ اور ہی چیز ہے: ''آپ کی ہر جنبش اس حد کے اندر ہو جو خدا نے آپ کے لیے مقرر کی ہے۔ آپ کا ہر فعل اس طریقے کے مطابق ہو جو خدا نے آپ کے لیے مقرر کیا ہے — ایسی زندگی میں آپ کا سونا بھی عبادت ہے اور جاگنا بھی، کھانا بھی عبادت ہے اور پینا بھی، چلنا پھرنا بھی عبادت ہے اور بات کرنا بھی، حتیٰ کہ اپنی بیوی کے پاس جانا اور اپنے بچے کو پیار کرنا بھی عبادت ہے (خطبات، ص:۱۳۶) جو ایک خدا کو معبود بنائے وہ ''اپنی پوری زندگی کو، خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی و نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کردے۔'' (تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل۔ ل ع، ص:۴۴) نماز روزہ ہو اور اخلاق صالحہ نہ ہوں، اس تناقض پر بھی وہ ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں: یہ کس طرح ممکن ہے کہ آدمی نماز پڑھ کر ''جب اپنے کام کاج کی طرف واپس آئے تو جھوٹ بولے؟ بے ایمانی کرے؟ لوگوں کے حق مارے؟ رشوت کھائے اور کھلائے؟ سود کھائے اور کھلائے؟ خدا کے بندوں کو آزار پہنچائے۔'' (خطبات، ص:۱۵۸)

۴- ہر مسلمان موت کے بعد حساب کتاب اور جزا سزا پر ایمان رکھتا ہے، لیکن اس ایمان کا اثر اس کے دنیوی زندگی پر نہیں پڑتا۔ چوتھا کام انہوں نے یہ کیا کہ ایک طرف یہ یقین واضح اور مضبوط کیا کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے، اور دوسری طرف دنیا اور آخرت کی زندگی کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ آخرت میں جو کچھ ملے گا، دنیا کے اعمال کا نتیجہ ہوگا، اس لیے دنیا کا ہر لمحہ، ہر کام اور ہر چیز اہم ہے۔ ''دنیا اور آخرت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی سلسلہ ہے، جس کی ابتدا دنیا ہے اور انتہا آخرت — (یہاں) گیہوں بوئیں گے تو گیہوں پیدا ہوگا، کانٹے بوئیں گے تو کانٹے ہی پیدا ہوں گے، کچھ نہ بوئیں گے تو کچھ نہ پیدا ہوگا۔'' (خطبات، ص:۷۳)

۵- دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے قانونِ الٰہی کی اطاعت پر جتنا زور سید مودودیؒ نے دیا، اتنا ہی زور انہوں نے اعمال کی اصل حقیقت اور روح پر دیا، اور اسے دلوں میں اتارا۔ اس طرح انہوں نے ظاہری اعمال اور باطنی ترقی کو، پھر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا۔ ایک طرف انہوں نے اعمال کے بے مقصد اور بے روح ہو جانے کا ماتم کیا اور اسے مسلمانوں کے اعمال کے بے اثر ہو جانے کا اصل سبب قرار دیا۔ دوسری طرف انہوں نے بے جان، رسمی مذہبیت پر پے در پے ضربیں لگائیں۔

اگر عبادات کی ادائی کے باوجود، زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، نہ مسلمان اللہ سے عہد وفا، وفا کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روح رخصت ہو چکی ہے اور اعمال جسد مردہ بن چکے ہیں۔ ''نہ اب نمازوں میں وہ اثر ہے جو کبھی تھا، نہ روزوں میں ہے، نہ قرآن خوانی میں اور نہ شریعت کی ظاہری پابندیوں میں۔ اس لیے کہ جب روح ہی موجود نہیں تو نرا بے جان جسم کیا کرامت دکھائے گا!'' (خطبات، ص:۱۰۱) اگر نماز جیسی زبردست اصلاح کرنے والی چیز سے بھی کسی مسلمان کی اصلاح نہیں ہوتی تو ''یہ اس کی طینت کی خرابی ہے، نماز کی خرابی نہیں۔ پانی اور صابن کا قصور نہیں اس کی وجہ کوئلے کی اپنی سیاہی ہے۔'' (خطبات، ص:۱۵۰)

یہ روح کیا ہے؟ خدا کی غیر مشروط اور مکمل وفاداری اور سب سے بالاتر اس کی محبت! یہ روح جتنی قوی ہوگی اتنی ہی روحانی اور باطنی ترقی ہوگی۔ ورنہ روحانی ترقی یہ نہیں ہے کہ ''آدمی ایک اچھا ریڈیو سیٹ، ایک طاقت ور دوربین اور ایک نازک خوردبین بن جائے...'' (ن ز، ص

۳۶۴)۔نہ زہد و تقویٰ اور احسان یہ ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی کرے، مصنوعی طور پر اپنے کو ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیمایش کی جا سکتی ہو، چاشت و اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھے، ذکر و شغل اور مراقبے کرے، مگر ایک نہ ہو' تو وہ حقیقی دینداری جو 'سر داد نہ داد دست در دست یزید' کی کیفیت پیدا کرے، اور 'بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا' کے مقام وفاداری پر پہنچا دے۔'' (ن ز،ص:۲۴۵-۲۵۱)

۶- راہ خدا میں سر دینے اور قدم یار پر نثار کرنے کی آرزو اور جستجو کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ قرآن، ایمان اور جہاد کے درمیان بھی لازم و ملزوم کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ وہ جہاد کا ذکر ایمان کے ساتھ ایمان کے لازمی تقاضے اور ایمان صادق کی کسوٹی کے طور پر بار بار کرتا ہے۔ سچے مومن وہ ہیں جو جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کریں (الحجرات ۴۹: ۱۵)۔ عمل صالح کی ایک جامع تعبیر صلوٰۃ و زکوٰۃ ہے، تو دوسری، جہاد فی سبیل اللہ۔ لیکن جہاد تمام اعمال میں چوٹی کا عمل ہے۔ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہے، کہ یہ اس کے مشن کی تکمیل کی جدوجہد ہے اسی لیے قرآن مطالبہ کرتا ہے کہ مومن کو جہاد دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر اس طرح محبوب ہونا چاہیے جس طرح اللہ اور اس کے رسول (التوبہ)۔ جہاد کی پکار بلند ہوتے ہی، وہ ہر عذر کو ترک کر کے اور ہر قربانی دے کر جہاد کے لیے نکل کھڑا ہو۔ لیکن بدقسمتی سے عرصے سے مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ جہاد کے لیے انہیں جنبش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، کہ جہاد نہ کرنے سے ان کے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سید مودودیؒ کا سب سے بڑا فکری کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایمان اور جہاد کے درمیان جو خلیج پیدا ہو چکی تھی اسے پاٹ دیا، جو زنجیر ٹوٹ چکی تھی، اسے جوڑ دیا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے قرآن کے پیغام جہاد کے تمام اجزا کو زندہ کیا اور اسے مومن کے قلب و نگاہ میں وہی مقام دیا جو قرآن کو مطلوب ہے۔ یہ بات محض حسن اتفاق نہیں کہ ان کی فکری خدمات کا آغاز ہی **الجہاد فی الاسلام** جیسی معرکہ آرا کتاب سے ہوا، جس کی نظیر نہ عربی میں ہے نہ اردو میں۔ اس کتاب کے ذریعے انہوں نے اغیار کی بڑی قلم کاریوں سے بنائی ہوئی اس تصویر کا طلسم بھی توڑ دیا کہ جہاد کی وجہ سے اسلام کی تاریخ سے بوئے خون آتی ہے، یہ اس کی دہشت گردی کا مظہر ہے۔ ان کی نظر میں جہاد سے غفلت ہی وہ مرض ہے جو ہر عمل کی خصوصاً نماز، روزے کی

جان نکال لیتا ہے: ''اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جس دل میں جہاد کی نیت نہ ہو اور جس کے پیش نظر جہاد کا مقصد نہ ہو اس کی ساری عبادتیں بے معنی ہیں'' اور نہ ان سے اسے خدا کا تقرب نصیب ہوتا ہے (خطبات، ص: ۳۱۸)۔ کیوں کہ ''اگر آپ واقعی اس دین کو حق سمجھتے ہیں تو آپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس دین کو زمین پر قائم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیں، اور یا تو اسے قائم کر کے چھوڑیں یا اس کوشش میں جان دے دیں۔'' (خطبات، ص: ۳۲۶) یہی کسوٹی ہے ایمان کے صداقت کی۔

جہاد کی یہ اہمیت مسلمانوں کے ذہنوں سے کیوں غائب ہوگئی؟ ''یہ سوال مجھ سے نہ کیجیے بلکہ ان لوگوں سے کیجیے جنھوں نے مسلمانوں کی توجہ ان کی اصل مشن سے ہٹا کر — نجات اور فلاح اور حصول مقاصد کے لیے شارٹ کٹ تجویز کیے، — اسلام کے کلیات اور اصول و مقاصد کو لپیٹ کر تاریک گوشوں میں پھینک دیا اور مسلمانوں کے ذہن کو — جزئیات کی بحثوں میں ایسا پھنسایا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مقصد تخلیق کو اور اسلام کی حقیقت کو قطعی بھول گئے۔'' (ن ز، ص: ۳۲۵)

۷- جہاد کو جو اعلیٰ مقام قرآن نے دیا ہے، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف وہی امت مسلمہ کے مقصد وجود اور مشن کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ سید مودودی کے سارے فکری کارنامے کا مدعا و مقصود یہی ہے کہ انھوں نے اسلام اور مسلمان کی اصل حقیقت اور امت کے مقصد و مشن کو آشکار کیا، اس کی طرف مسلسل پکارتے رہے، اور ایمانی زندگی اور جہاد کو اس کے تابع کر دیا۔ انھوں نے کہا: اسلام کو عام معنوں میں ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ ''دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق اسے تعمیر کرنا چاہتا ہے۔'' اسی طرح، مسلمانوں کو عام معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا ہے، جب کہ ''مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے منظم کرتا ہے۔'' (ت ق، م ۳۹، ن ز، ص: ۲۹۸)۔ اور ہر دین کی طرح یہ دین بھی یہی کہتا ہے کہ اقتدار خالصاً و مخلصاً میرا ہونا چاہیے اور ہر دوسرا دین میرے مقابلے میں مغلوب ہونا چاہیے۔ (خطبات، ص: ۳۳)

اسی لیے ''امت بنانے کی واحد غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ آپ

تمام بندگان خدا پر شہادت حق کی حجت پوری کر دیں ــــ یہ آپ کی امت کا عین مقصد وجود ہے، جسے آپ نے پورا نہ کیا تو گویا اپنی زندگی ہی اکارت گنوادی'' (ن ز، ص: ۳۳) اور اسی لیے ''دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے، اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہوسکتا، جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے ــــ اس معاملے میں جو شخص کمزوری دکھائے اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے، پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے ــــ روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی مومن ہو تو تب بھی اس کے لیے درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظام باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے یا ــــ شرعی حیلے تلاش کر کے غلبہ کفر وفسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے ــــ (ن ز، ص: ۲۱۱-۲۱۳)

آدمی اکیلا بھی ہو تو ''سیدھا اور صاف راستہ یہی ایک ہے کہ بندگان خدا کو اس طریق زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے۔'' کوئی ''سن کر نہ دے تو اس کی ساری عمر صراط مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مر جانا'' اس سے بہتر ہے کہ وہ غلط صدائیں بلند کرنے لگے یا غلط راہوں پر چلنے لگے۔ (ن ز، ص: ۲۱۳)

پھر وہ اقامت دین کے لیے جماعتی زندگی ناگزیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''چونکہ یہ مقصد اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا'' اس لیے کوئی بھی سننے والا مل جائے تو ''لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اس مقصد عظیم کے لیے جدوجہد کرنے میں صرف کر دے۔'' (ن ز، ص: ۲۱۳)

خدا کا حکم ماننے میں آزمایشوں اور جہاد میں قربانیوں سے مفر نہیں۔ وہ ان کے لیے بھی تیار کرتے ہیں: ''مالک کی مرضی کے مطابق کام کرنے میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ جان جاتی ہو تو جائے، ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہیں تو ٹوٹیں، اولاد کا نقصان ہوتا ہے تو ہو، مال و جائیداد برباد ہو تو ہوا کرے، تمھیں کیوں غم ہو؟ جس کی چیز ہے وہی نقصان پسند کرتا ہے تو اس کو حق ہے۔'' (خطبات، ص: ۶۰)

۸- اگر تاریخ کا عمل صرف اندھی مادی وطبعی قوتوں کا کھیل ہو، تو ایمان لازماً زندگی

کے کونے کھدرے میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر قرآن کے اتباع میں سید مودودی ایمان کو، دل کی طرح، تاریخ میں بھی مرکز ومحور بنا دیتے ہیں۔ قوموں کا مقدر ایمان اور اخلاق کی میزان میں تلتا ہے، اور اٹھتا گرتا ہے۔ ''اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج وزوال پر فرماں روا ہیں۔'' (ن ز، ص: ۲۱۷) ''اخلاقی طاقت کی فراوانی مادی وسائل کے فقدان کی تلافی کر دیتی ہے، مگر مادی وسائل کی فراوانی اخلاقی طاقت کے فقدان کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔'' (ت ن، ص: ۲۴۲)۔ اس تناظر میں وہ بار بار امت مسلمہ کی حالت زوال کا ذکر کرتے ہیں، اور بار بار زور دے کر کہتے ہیں کہ تمہارا مقدر، تمہاری موجودہ ذلت وغلامی اور مستقبل کی سربلندی صرف ایمان اور جہاد سے وابستہ ہے۔

''کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان اور اس پر خدا کا غضب نازل ہو! مسلمان اور ذلیل ہو! مسلمان اور غلام ہو! یہ تو ایسی ناممکن بات ہے جیسے کوئی چیز سفید بھی ہو اور سیاہ بھی'' (خطبات، ص: ۴۰)۔ ''یہ قطعی ناممکن ہے کہ کوئی قوم خدا کے کلام کی حامل ہو اور پھر دنیا میں ذلیل وخوار ہو، دوسروں کی محکوم ہو، پاؤں میں روندی اور جوتیوں سے ٹھکرائی جائے، اس کے گلے میں غلامی کا پھندا اور غیروں کے ہاتھوں میں اس کی باگیں ہوں اور وہ اس کو اس طرح ہانکیں جیسے جانور ہانکے جاتے ہیں۔'' (خطبات، ص: ۴۸)

یہ صورت حال کیوں ہے؟ ''کیا نعوذ باللہ تمہارا خدا ظالم ہے؟— اگر تمہارا ایمان ہے کہ خدا ظالم نہیں ہے، اور اگر تم یقین رکھتے ہو کہ خدا کی فرماں برداری کا بدلہ ذلت سے نہیں مل سکتا، تو پھر تمہیں ماننا پڑے گا کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ جو تم کرتے ہو اس میں کوئی غلطی ہے۔'' (خطبات، ص: ۴۰)۔ مزید، جو قوم خدا کی کتاب رکھتی ہو اور پھر ذلیل وخوار اور محکوم ومغلوب ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ ضرور کتاب الٰہی پر ظلم کر رہی ہے، اور اس پر یہ سارا وبال اسی ظلم کا ہے۔ خدا کے اس غضب سے نجات پانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کی کتاب کے ساتھ ظلم کرنا چھوڑ دیا جائے'' (خطبات، ص: ۴۹)— ہم حق کی شہادت دینے میں جتنی کوتاہی کرتے گئے اور باطل کی شہادت ادا کرنے میں ہمارا قدم جس رفتار سے آگے بڑھا ہے، ٹھیک اسی رفتار سے ہم گرتے چلے گئے ہیں— دنیا کی صفائی واصلاح کے ذمے دار ہم تھے، ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دیا تو دنیا خار دار جنگلوں سے بھر گئی اور ان کا سب سے زیادہ پرخار حصہ ہمارے نصیب میں لکھا گیا۔ (ن ز، ص: ۳۴۵)

لیکن، اگر مسلمان قرآن کی دعوت پر لبیک کہیں اور اپنا فریضہ بحیثیت مسلمان ادا کریں، تو سید مودودی پورے یقین کے ساتھ انہیں یہ بشارت دیتے ہیں ''ایک وقت وہ آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہوگا، (زمین بوس ہوگیا!) سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کے لیے لرزہ براندام ہوگی— اور یہ آج کا دور صرف تاریخ میں ایک داستان عبرت کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالم گیرو جہاں کشا طاقت کے نام لیوا کبھی اتنے بے وقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور لاٹھیوں اور رسیوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔ (ن ز،ص: ۳۴۵)

امت مسلمہ کی ترقی اور سربلندی کا کوئی نسخہ، ان کی نظر میں ایمان اور عمل صالح کے ماسوا نہیں۔ ''ایک قوم کو جو چیز زندہ اور طاقت ور اور سربلند بناتی ہے— وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قائم ہوتی ہے، اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں راسخ ہو جانا اور اعمال پر حکمراں بن جانا ہے۔'' (ت ن،ص: ۲۴۳، ۲۴۴) اسی لیے ترقی اور غلبے کے لیے'' آپ تعجب کریں گے کہ قرآن نے— کہیں یہ نہیں کہا کہ تم یونی ورسٹیاں بناؤ، کالج کھولو، کارخانے قائم کرو، کمپنیاں قائم کرو، بینک کھولو، سائنس کے آلات ایجاد کرو—'' (ت ن، ص: ۲۴۶) اگر چہ وہ فوراً وضاحت کر دیتے ہیں کہ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ علوم وفنون اور مادی ترقی کے وسائل کی جائز اہمیت سے انکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لیے یہ تمام چیزیں ثانوی درجے پر ہیں۔''

(ت ن،ص: ۲۴۸)

۹- دین میں انحراف و بگاڑ کا سب سے بنیادی سبب سید مودودی کے نزدیک، عبادت اور دین کا زندگی کے چند گوشوں تک محدود ہو جانے، دین و سیاست کی تفریق، اور خلافت کے بالتدریج ملوکیت میں تبدیل ہونے کا عمل ہے اور احیائے ایمان کا لازمی نتیجہ اسلام کی ریاست مطلوب، مکمل اسلامی نظامِ حیات اور اسلامی تہذیب کا قیام ہوگا۔ اس انحراف کو دور کرنے اور مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے سید مودودی نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

انہوں نے اس تصور کو— کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے— آج کے زمانے میں مقبول عام بنا دیا: ''اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے، نماز، روزے، حج و زکوٰۃ سے ہو یا معیشت و معاشرت اور تمدن و سیاست سے، اسلام کا کوئی حصہ بھی غیر ضروری نہیں

ہے، پورے کا پورا اسلام ضروری ہے۔'' (ل ع،ص:۳۹)۔ انہوں نے دین وسیاست کی تفریق کے تصور کو فکر کی سطح پر ختم کردیا: ''مسلمان اپنے ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرسکتے جب تک وہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم نہ کرلیں۔'' اس لیے ''خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے'' (ار،ص:۵۶، ۵۷)۔ یہ فکر بھی لدائج عام ہوگئی۔ انہوں نے اسلامی ریاست کے خدوخال، اصول اور دستور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس کے بگاڑ کے راستوں کی بھی نشان دہی کی۔ (اسلامی ریاست اور خلافت وملوکیت)

اسلامی ریاست کے ضمن میں انہوں نے تفصیل سے اور محکم استدلال کے ساتھ اسلام میں جمہوریت کا اثبات کیا: ''خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں — یہ ہے اسلام میں جمہوریت کی بنیاد —

''ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ کی ڈکٹیٹر شپ کے لیے کوئی گنجایش نہیں، اس لیے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا گروہ کو یہ حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کرکے خود حاکم مطلق بن جائے — ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل وبالغ مسلمان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔''

(اسلامی ریاست۔ ار: ۱۴۰-۱۴۳ بحوالہ اسلام کا نظریہ سیاسی، ۱۹۳۹)

''ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے (مغربی جمہوریت) میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے، اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے۔''

(ار،ص:۳۲۰)

۱۰- ناقص ایمان اور اسلام کو پرائیویٹ زندگی میں چند مراسم تک محدود کردینے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تناقضات پر سید مودودی نے بھرپور تنقید کی: ''کیا اس (ایمان میں) نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا سبحہ گردانی یا تہجد خوانی سے پوری ہوسکتی ہے۔'' (ن ز،ص:۲۳۸) ''اپنے کو مسلمان بھی کہنا، اور پھر قرآن وسنت کے مقابلے میں اپنے خیال یا دنیا کے دستور یا کسی انسان کے قول یا عمل کو ترجیح دینا، یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔''

لیکن یہ فتوے کی زبان نہیں، نصیحت، موعظہ اور جدال بالاحسن کی زبان ہے۔ اس

لیے وہ ایک طرف یہ وضاحت کر دیتے ہیں کہ ''میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وضع قطع، لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں، میں ان کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں، یا انہیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔'' (ن ز،ص:۲۴۷) دوسری طرف وہ کہتے ہیں: ''کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ میں مسلمانوں کو کافر بنانے چلا ہوں۔ نہیں، میرا یہ مقصد ہرگز نہیں۔'' (خ ز،ص:۴۱) ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تکفیر اور فرقہ واریت کے خلاف جتنا مضبوط بند انہوں نے باندھا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

اول، انہوں نے حقیقی اور قانونی اسلام میں امتیاز قائم کیا، جو اس فتنے کی روک تھام کے لیے بہت بڑی خدمت ہے۔ انہوں نے کہا: ضروری ہے کہ اسلام کے زبانی ''اقرار کے ساتھ جتنے لوگ مسلم سوسائٹی میں داخل ہوں وہ سب مسلمان مانے جائیں، ان میں سے کسی کی تکفیر نہ کی جائے۔'' (خ ط،ص:۱۰۳) انہیں وہ حقوق دینے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا جو ان کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوں۔ (ار،ص:۴۵)

دوسرے، انہوں نے تکفیر کے بارے میں یہ اہم اصول قائم کیا: ''میں یہ بات قطعی جائز نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کو مشرک کہا جائے اور مشرکین کا معاملہ ان کے ساتھ کیا جائے، جو کلمہ **لا اله الا الله محمد رسول الله** کے قائل ہیں — اور اس کے بعد تاویل کی غلطی کے باعث کسی مشرکانہ عقیدے اور عمل میں مبتلا ہو گئے ہیں، ہمیں ان پر کوئی برا لقب چسپاں کرنے کے بجائے حکمت اور استدلال سے ان کی یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

(رم، ح۳،ص:۴۵۹)

اسی لیے انہوں نے نصیحت کی کہ جو لوگ سب کی اصلاح کے لیے اٹھے ہوں وہ سب مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور ان کی خرابیوں کو ہمدردی اور محبت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک عام غلط فہمی کو دور کیا: ''رہا یہ اندیشہ کہ جس شخص کو آپ اپنے نزدیک گمراہی اور شرک میں مبتلا پاتے ہیں اس کی نماز چونکہ آپ کے عقیدے کے مطابق مقبول نہیں ہے، اس لیے اگر آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو آپ کی نماز نہ ہو گی تو یہ اصلاً غلط ہے۔ اول تو آپ یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہی نہیں ہیں کہ کس کی نماز مقبول ہو گی اور کس کی

نہ ہوگی۔ ایسے فیصلے کرنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی دعا کریں اور دوسروں کی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی۔ دوسرے یہ کہ ہر فرد کی نماز انفرادی حیثیت ہی سے خدا کے حضور پیش ہوتی ہے، اور اگر وہ مقبول ہونے کے قابل ہو تو بہر حال مقبول ہو کر رہتی ہے، خواہ امام کی نماز مقبول ہو یا نہ ہو۔'' (رم، ح ا، ص:۲۰۱-۲۰۲)

تیسرے، انہوں نے دین اور شریعت کے درمیان فرق قائم کیا، جس کو نہ سمجھنا تکفیر اور فرقہ واریت کی جڑ ہے۔ ایک دین کا ماننا سب کے لیے ضروری ہے، مگر لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق شریعت پر چل سکتے ہیں۔ خواہ ان کے عمل میں کتنا ہی فرق ہو، ان میں سے کوئی اسلام سے خارج نہ ہوگا — جو دوسروں کو اپنی سمجھ کے ماننے پر مجبور کرتا ہے اور نہ ماننے پر ان کی تکفیر کرتا ہے، وہ گویا کہتا ہے کہ ''صرف خدا ہی تمہارا خدا نہیں، بلکہ میں بھی چھوٹا خدا ہوں۔'' (خ ط، ص:۱۲۴-۱۲۵)

چوتھے، انہوں نے منصوص اور غیر منصوص کے درمیان فرق قائم کیا، اور صاف کہا کہ:

''اس اصول پر مجھے شدت سے اصرار ہے کہ آدمی صرف حکم منصوص کی خلاف ورزی سے ہی گناہ گار قرار پاسکتا ہے — اسی طرح مجھے اس بات پر بھی اصرار ہے کہ حرام صرف وہ ہے جسے خدا اور رسول نے بالفاظ صریح حرام کہا ہو، یا جس سے صاف الفاظ میں منع کیا ہو، یا جس میں مبتلا ہونے والے کو سزا کی وعید سنائی ہو، یا نصوص کے اشارات واقتضا آت سے، جن کی حرمت مستنبط ہونے پر اجماع ہو۔'' اجتہادی احکام کی خلاف ورزی کسی کو گناہ گار نہیں بناتی، اور اجتہاد سے حرام ٹھہرائی چیزیں، جن میں ایک سے زیادہ قول کی گنجایش ہو، مطلقاً حرام نہیں ہیں، سوائے اس شخص کے لیے جو اس اجتہاد کو صحیح تسلیم کرے۔ (رم، ح ۲، ص:۲۷۱)

پانچویں، انہوں نے منصوص و غیر منصوص اور مسنون و غیر مسنون کے درمیان فرق قائم کیا: ''میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا، اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاح شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا، بدعت ہے اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریف دین کی موجب ہوتی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے، اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں، جس کو قائم و جاری کرنے کے

لیے آپ مبعوث ہوئے تھے، درآں حالے کہ جو امور آپ ﷺ نے عادتاً کیے ہیں، انہیں سنت بنا دینا، اور تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ہرگز منشا نہ تھا۔'' (رم، ح ۱، ص: ۲۴۱)

۱۱- آخر میں ہم اجتہاد کے باب میں سید مودودی کی اہم مجتہدانہ خدمات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ مستقبل کی نقشہ گری میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔

وہ اہمیت کے لحاظ سے مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب میں اجتہاد کا مقام جہاد کے پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں: ''جب مسلمان تھک گئے، ان کی روح جہاد سرد پڑ گئی، قوت اجتہاد شل ہو گئی تو ان کی ترقی کی رفتار رک گئی اور وہ امامت کے منصب سے معزول ہو گئے۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا، مغربی قوموں نے اٹھا لیا، وہ علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے، مسلمان سوتے رہے اور امامت کا منصب ان کو مل گیا۔

(تنقیحات، ص: ۳۸-۳۹)

اول، مسلمانوں کی ذہنی غلامی کی وجہ بھی ترک اجتہاد ہے: ''مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں — جب وہ اکتساب علم اور اجتہاد فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انہوں نے خود دنیا کی راہ نمائی سے استعفیٰ دے دیا۔'' (ت ن، ص: ۸، ۹) نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مگر ان کے دماغ مغربی تہذب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔

دوسرے، وہ اجتہاد کی نوعیت اور ضرورت کا تعین کرتے ہیں: یہ مشکل ''اس وقت تک دور نہ ہو گی جب تک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر نہ پیدا ہوں گے — پرانے اسلامی محققین و مفکرین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کو اب الٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں، جن سے وہ چھ سو سال پہلے گزر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں راہ نمائی وہی کر سکتا ہے، جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔''

(ت ن، ص: ۲۰)

تیسرے، وہ اسلام کے علمی جمود کا تجزیہ کرتے ہیں: ہمارے اہل علم نے، الا ماشاء اللہ، اسلام کو ایک جامد اور غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی صدی ہجری کے بعد سے ان کے ہاں

جنتری بدلنی بند ہوگئی ہے، دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ رہی ہے، دنیا کے حالات، خیالات، رجحانات، نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو رہے ہیں، تمدن کے معاملات اور مسائل کتنے پلٹے کھا رہے ہیں، مگر یہ راہ نما ابھی تک ماضی میں رہتے ہیں، اسی فضا میں سوچتے ہیں، اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے ہیں جو خدا کی کتابیں نہیں کہ زمانے کی قیود سے بالاتر ہوں۔ وہ ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو خدا کے نبی نہیں کہ ان کی بصیرت اوقات اور حالات کی بندشوں سے آزاد ہو، پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب راہ نمائی کر سکیں جب زمانہ بالکل بدلتا جا رہا ہے۔
(ت ن، ص: ۴۱-۴۳-۱۸۱)

چوتھے، وہ اس خرابی کی جڑ کا تعین کرتے ہیں: اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے، فروع نے اصول کی جگہ لے لی اور پھر ان سے ہزار در ہزار فروع نکل آئے جو اصل اسلام قرار پا گئے۔ ملت اسلامی اس ترتیب پر قائم تھی: پہلے قرآن مجید، پھر رسول اللہ ﷺ، پھر اہل علم کا اجتہاد — بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا۔ (ت ن، ص: ۱۸۲)

پانچویں، وہ انسانی اجتہاد کا مقام متعین کرتے ہیں: کسی انسان کا اجتہاد دنیا کے لیے دائمی اور اٹل قانون نہیں بن سکتا، کیوں کہ اس کی عقل اور علم دونوں ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتے ہیں۔ (ت ن، ص: ۱۸۲)

چھٹے، وہ آج کے چیلنج کا تعین کرتے ہیں: نئے نئے پیچیدہ علمی و عملی مسائل حل کیے جائیں، غالب مغربی تہذیب کے اصول و مبادی کو سمجھا جائے، ان کے علوم کا مطالعہ کیا جائے، ان کے کار آمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کیا جائے، نئے کل پرزوں کو تمدنی زندگی میں اس طرح نصب کر دیا جائے کہ صدیوں کے جمود کے نقصان کی تلافی ہو جائے، اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے لگے۔ (ت ن، ص: ۴۱)

ساتویں، وہ جمود کو حرکت میں بدلنے کی تدبیر تجویز کرتے ہیں: صحیح تدبیر یہ نہیں ہے کہ فرنگیت اختیار کی جائے، اسلام کی قطع و برید شروع کر دی جائے، ائمہ مجتہدین کی عمارتوں کو ڈھا دیا جائے، حدیث کے سارے ذخیرے کو آگ میں پھونک دیا جائے، کلام الٰہی میں ترمیم و تنسیخ کی جائے۔ صحیح تدبیر صرف یہ ہے کہ جس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سے سیدھا کر دیا

جائے، قرآن وسنت کو پیشوا بنایا جائے، ائمہ سلف کی جن چیزوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں انہیں بدستور رہنے دیا جائے، مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں، اٹل قانون ہے۔

(ت ن، ص: ۱۸۶، ۱۸۷)

آٹھویں، وہ فقہ وتمدن کی طرح دعوت واصلاح اور انقلاب اسلامی کی حکمت عملی کے دائرے میں بھی اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں: کوئی بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر ایک وقت ایک تدبیر موزوں اور کارگر ہو اور دوسرے وقت نہ رہے تو بلا تامل اس کو بدل دیں — جو شخص حالات اور مواقع وذرائع کی تبدیلی کے ساتھ اصولوں پر عمل درآمد کی شکلیں نہ بدل سکے، وہ اس عطائی طبیب کی طرح ہے جو ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔ (ل ع، ص: ۵۹، ۶۰، ۱۱۵-۱۱۷)

اسلام کی اصولی دعوت ایک ہی ہے، لیکن تمام معاشرے ایک جیسے نہیں ہوتے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ حالات بعینہ وہی ہوں جو کسی نبی کے عہد میں تھے۔ اس لیے اسلام کے لیے کام کرنے والا وقت اور مقام کے حالات دیکھے اور سمجھے، اور ایسا طریق کار اختیار کرے جو ان حالات میں مناسب ترین ہو۔ (رم، ح ۵، ص: ۳۳۶، ۳۳۷)

اس سلسلے میں وہ جمود کے اصل سبب پر انگلی رکھ دیتے ہیں: ''اصل رہنما اور حقیقی مصلح (جیسے سید مودودی تھے) اجتہاد وفکر سے کام لیتا ہے اور وقت اور موقعے کے لحاظ سے جو مناسب تدبیر ہوتی ہے اسے اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کی اتباع کرتے ہیں وہ اندھے مقلد ہوتے ہیں۔ جس طریقے کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا اس طریقے پر یہ اس وقت کے گزر جانے کے بعد بھی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو انسب تھا حال میں وہی غیر انسب ہے۔ پچھلی صدی کے راہ نماؤں کے بعد ان کے متبعین آج بھی اس روش پر اصرار کر رہے ہیں، جس پر ان کے راہ نما انہیں چھوڑ گئے تھے، حالاں کہ وہ وقت جس کے لیے انہوں نے وہ روش اختیار کی تھی، گزر چکا ہے۔ اب اجتہاد وفکر سے کام لے کر نیا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔'' (ت ن، ص: ۱۷۰)

آج کی ضرورت، آج کا چیلنج یہی ہے۔ سید مودودی نے اپنی فکری خدمات پر ''فکر مودودی'' کی چھاپ لگنے کی شدت سے روک تھام کی، اور ان کو معیار حق ماننے کا کسی کو

پابند نہیں کیا، تو صرف اس لیے کہ ''راہ خدا میں ان کے ہم سفر'' آنکھیں بند کر کے نہ چلیں۔ آج ان کی فکر کے صحیح وارث وہی ہو سکتے ہیں جو ان کی فکری خدمات کی روشنی میں، اجتہاد و فکر سے کام لیں، ماضی کے اسیر نہ ہوں، حال کے مناسب طریقے اختیار کریں، اور مستقبل کے نقیب بنیں، ٹھیک جس طرح انہوں نے اپنے زمانے میں کیا۔

بابِ ہفتم :

اقامتِ دین

(1) اقامتِ دین کی حقیقت

(2) اقامتِ دین فرض کیوں ہے؟

(3) امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی

(4) غلبۂ دین کی جدوجہد

اقامتِ دین کا مطلب

اقامتِ دین کے فرض و واجب ہونے کی دلیلیں پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا مطلب اور مفہوم واضح کر دیا جائے۔

''اقامت دین'' میں دین سے مراد وہ دین حق ہے، جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے، جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پزیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔

اِس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرح سے یکسو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

دستور جماعت اسلامی ہند کی اس عبارت میں دین اور اقامت دین کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دین اسلام کو اس کے تمام احکام و قوانین اور اس کی تمام تعلیمات و ہدایات کے ساتھ پوری انسانی زندگی کا دین بنایا جائے۔ زندگی کو چند شعبوں اور چند خانوں میں تقسیم کر کے بعض

میں اسلام کی پیروی کرنا اور بعض میں غیر اسلام کی پیروی کرنا قطعاً غلط ہے، جس طرح مسجد میں اسلام کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح بازار میں، اسمبلی میں اور پارلیمنٹ میں بھی اس کے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پارلیمنٹ میں بیٹھ کر اسلام کے خلاف قانون بنانا یا اپنے جی سے گھڑے ہوئے احکام صادر کرنا، اللہ سے بغاوت کرنا ہے، جو اس پوری کائنات کا تنہا بادشاہ اور برحق حکمراں ہے اور جب تک یہ بغاوت ختم اور اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو اقامت دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

اقامت دین کا مثالی نمونہ

اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین نمونہ وہ ہے، جسے حضرت محمد ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔

اس مثالی نمونے کے لیے خلافت راشدہ خلافت علی منہاج النبوہ (نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق خلافت)، حکومت الٰہیہ اور اسلامی حکومت کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین نے جو حکومت قائم کی تھی اس میں بغیر کسی تفریق و تقسیم کے پورے دین اسلام کی مخلصانہ پیروی کی جاتی تھی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کر دیا گیا تھا کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل ٹھیک ٹھیک اسی دین کے مطابق تھی۔ اس مملکت میں جا کر ہر شخص اپنی کھلی آنکھوں سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ اسلامی حکومت اور قرآنی معاشرہ کیسا ہوتا ہے اور "اقامت دین" کا مفہوم کیا ہے، جس طرح ایک کھڑے ہوئے شخص کے قد و قامت، جسمانی ساخت، رنگ و روپ اور چہرے مہرے کو پہچاننے کے لیے دو آنکھیں کافی ہیں، اسی طرح اقامت دین کا صحیح مفہوم جاننے کے لیے عہد رسالت و عہد خلافت راشدہ کا مثالی نمونہ کافی ہے، جس کی بلند قامتی اور اس کے تمام رنگ و روپ تاریخ کے صفحات نے محفوظ کر لیے ہیں۔ یہ مثالی نمونہ صرف نمونہ ہی نہیں ہے بلکہ فریضۂ اقامت دین کی ایک روشن دلیل بھی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا نتیجہ

سینکڑوں سال سے مسلمان جس زوال و انحطاط کا شکار ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمان بھی عام طور سے دین اسلام کو اسی طرح کا ایک مذہب سمجھتے ہیں، جس طرح کے اور دوسرے مذاہب پائے جا رہے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے مذہب کو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق، وراثت

اور اسی طرح کے چند مسئلوں تک محدود کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک وعظ ونصیحت کی مجلسوں، میلاد کی محفلوں اور کلمہ ونماز کی تعلیم سے دین وایمان کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں، باقی رہی سیاست و حکومت تو انھوں نے اسے دنیا داری کے خانے میں ڈال کر اسے دنیا دار لوگوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس میں قصور مسلمان عوام کا نہیں بلکہ ان خاص لوگوں کا ہے، جنھوں نے ان کے دماغوں میں دین اسلام کا یہ محدود مفہوم اتارا اور جمایا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب جماعت اسلامی اور اس طرح کی دوسری جماعتوں کی سعی وکوشش سے نہ صرف ہندستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی دین اسلام کے بارے میں یہ بے بنیاد خیال ختم ہوتا جا رہا ہے اور مسلمان اسے پوری زندگی کا مکمل نظام اور قانون سمجھنے لگے ہیں۔ انھیں قرآن مجید کی آیات اور رسول مقبول ﷺ کی احادیث کی دلیلوں سے بتایا جا رہا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد اور ان کا نصب العین کیا ہے اور کس چیز کو ان کی تمام کوششوں اور جدوجہد کا مرکز ہونا چاہیے۔

قرآن مجید کے دلائل

''اقامت دین'' مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کے فرض وواجب ہونے کے دلائل سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ ہم اس کی دلیلیں اختصار کے ساتھ ذیل کے چند نکات کے تحت پیش کریں گے۔

۱- حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور اُنھیں دنیا میں بھیجنے کا مقصد۔
۲- سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپ کی نبوت ورسالت کا مقصد۔
۳- قرآن اور اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں نازل کرنے کا مقصد۔
۴- اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے خلاف حکم چلانے اور فیصلہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔
۵- چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو کوڑے لگانے کا حکم۔
۶- اقامتِ دین کے لفظ کے ساتھ قرآن کا صریح حکم۔
۷- دین اسلام کو غالب کرنے کی جدوجہد کرنے والوں سے مدد کا وعدہ۔
۸- غلبہ دین کی جدوجہد میں مال خرچ نہ کرنے والوں اور جان چرانے والوں کا حکم۔
۹- انسان اور جنات کو پیدا کرنے کی غرض۔
۱۰- اُمت مسلمہ کا نصب العین اور اس کا مقصد حیات۔

اِن دس نکات میں سے ہر نکتہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین اسلام کو غالب کرنا، اس کو قائم کرنا اور قرآن مجید کے تمام قوانین کو نافذ کرنا مسلمانوں کی ذمے داری اور ان کی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے۔

پہلی دلیل

ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا؟ ان کی حیثیت کیا تھی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں کس لیے بھیجا تھا؟ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں سب سے پہلے انسان ہی نہیں بلکہ اللہ کے سب سے پہلے پیغمبر بھی تھے، اس لیے انھیں دنیا میں بھیجنے کا جو مقصد ہوگا اس کے اہم ترین فریضہ حیات ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا مقصد کیا تھا، ان کی حیثیت کیا تھی اور انھیں کس ہدایت کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا تھا اس کا مفصل بیان سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ سے آیت ۳۹ تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ آیتیں واضح الفاظ میں یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی خلافت و نیابت کے عظیم ترین کام کی انجام دہی کے لیے دنیا میں بھیجا تھا اور یہی ان کی تخلیق کا مقصد تھا۔ اس دنیا میں ان کی حیثیت اللہ کے خلیفہ اور نائب کی تھی۔ آیت خلافت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا صدرالدین اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:

> ''خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے سونپے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ ذاتی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کیے ہوئے اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کی منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب نمک حرامی، غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔
>
> یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ یہ منصب خلافت اس کے تاج عظمت کا وہ درخشاں گوہر ہے جو کسی بھی مخلوق کو نہیں بخشا گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں اس بے نظیر نعمت کا ذکر بھی ایک خاص اہتمام سے فرمایا۔ پھر اس کی جناب سے ملائکہ کے سامنے تخلیق آدم سے پہلے ہی اس کے ارادے کا ذکر اور وہ بھی اسی منصب خلافت ہی کا نام لے کر، اس کی غیر معمولی اہمیت کا حامل

ہے۔شاید انسان کے اس نوعی شرف کا اس سے اونچا تخیل اور کوئی نہیں ہوسکتا۔اب انسان کی جس طرح یہ خود ناشناسی اور اپنی تحقیر ہے کہ وہ ان مخلوقات کے آگے سرِ نیاز خم کردے، جن پر اس کو نیابتی آقائی اور حکمرانی کا مقام بخشا گیا ہے۔اسی طرح اس کی یہ خود فریبی، خیانت اور غداری ہوگی کہ وہ اپنے اصل مالک کی مرضیات سے بے نیاز ہوکر من مانے طریقے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی اصل حقیقت ٹھیک ٹھیک بیان کردی گئی ہے اور نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کردیا گیا ہے، جس کے معلوم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی اور فلاح بخش ہیں جنھیں زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس سے ربط دے کر اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''(۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں:

''اور خلیفۃ اللہ وہ ہے، جو زمین پر اللہ کی شریعت کی حکومت قائم کرے۔''(۲)

ہمارے اگلے مفسرین نے اس کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، ہم یہاں صرف اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔امام بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:

''اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کی زمین پر اس کے احکام کی اقامت کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔''

تفسیر خازن میں اس کی تائید ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''اور صحیح قول یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ وہ اللہ کی زمین میں اس کی حدود کی اقامت کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔''

''خلیفہ'' کی تفسیر جلالین میں یہ ہے:

''وہ زمین پر میرے احکام کو نافذ کرنے میں میری نیابت کرے گا اور وہ خلیفہ آدم ہیں۔''

تفسیر بیضاوی میں اس طرح ہے:

''اور خلیفہ اس کو کہتے ہیں، جو دوسرے کا قائم مقام اور اس کا نائب ہو اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اس لیے کہ وہ زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح ہر نبی اللہ کے خلیفہ تھے۔اللہ نے تمام انبیاء کو زمین کی آبادی، لوگوں کے امور کی تدبیر، ان کے نفوس کی تکمیل اور ان پر احکامِ الٰہی کی تنفیذ کے لیے اپنا خلیفہ بنایا تھا۔اس لیے نہیں کہ اللہ کسی نائب

---

(۱) تیسیر القرآن، حاشیہ ۱۴۴،ص ۷۱، ۷۲

(۲) مولانا عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، ج ۱،ص ۹۵، ناشر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

کا محتاج ہے بلکہ اس لیے کہ جن لوگوں پر اس نے اپنا نائب مقرر کیا وہ بلاواسطہ اس کے اوامر اور اس کے فیض کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔''

اسی طرح کی عبارت روح المعانی میں بھی ہے، جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

''آدم زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح تمام انبیاء اللہ کے خلیفہ تھے۔''

مفسرین کرام کی ان عبارتوں سے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو جو خلافت ارضی عطا کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا:

''زمین کی آبادی، لوگوں کے لیے سیاست کی انجام دہی (یعنی ان کے تمام امور و معاملات کا انتظام اور تدبیر)، ان کے نفوس کی تکمیل، اللہ کے شرعی فیصلوں کی تنفیذ اور حدود الٰہی کی اقامت۔''

ہم نے اوپر دستور جماعت اسلامی ہند کے حوالے سے ''اقامت دین'' کا جو مطلب و مفہوم واضح کیا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے؟ مفسرین کرام نے ان چار نکات میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے انسانی زندگی کا کون سا شعبہ خارج ہے؟ مسلمانوں پر اقامت دین کے فرض و واجب ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی؟ جو کام انسان کی غایت تخلیق اور اس کا مقصد وجود ہو وہ بھی اس پر فرض نہ ہوگا تو آخر کون سا کام اس پر فرض ہوگا؟

سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط خلیفہ کے علاوہ ''خلیفہ'' کا لفظ ایک جگہ اور قرآن میں آیا ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (ص:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے زمین میں تمہیں اپنا نائب بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں میں حق و انصاف کے ساتھ حکومت کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔''

اس آیت میں اللہ نے صراحت کے ساتھ حضرت داؤدؑ کو اپنا خلیفہ اور نائب کہا ہے اور اس کا مقصد بھی یہی بیان کیا ہے کہ وہ اللہ کے اُتارے ہوئے قانون عدل کے مطابق حکومت کریں اور مقدمات کا فیصلہ سنائیں۔ اگرچہ منشائے تخلیق کے لحاظ سے تو ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ لیکن اس عظیم منصب کی عین فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ منصب، صفات کے ساتھ مشروط ہو، غیر مشروط نہ ہو۔ اس کے اہل اور جائز حق دار وہی لوگ ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں اور جو لوگ اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔ جب مومنینِ صالحین ہی خلافت الٰہی کے مستحق ہیں تو ان کے منصب کا یہ عین تقاضا ہے کہ وہ دوسرے گرے ہوئے انسانوں کو

بغاوت کی پستی سے اُٹھا کر انھیں خلافت الٰہی کی بلندی تک پہنچانے کی سعی کریں۔ اوپر کی تفصیل سے یہ بات خود ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو جو خدمت سپرد کی ہے وہ ایک ایسے نظام کی متقاضی ہے، جس کی بنیاد نیابت الٰہی کے نظریے پر رکھی گئی ہو۔ کیوں کہ اس کے بغیر یہ خدمت پوری طرح انجام نہیں دی جاسکتی۔

دوسری دلیل

سیدنا محمد ﷺ کی بعثت بھی اسی لیے ہوئی تھی کہ وہ دین حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کردیں۔ اس کی صراحت سورۂ توبہ آیت ۳۳، سورۂ صف آیت ۹، اور سورۂ فتح آیت ۲۸ میں ہے۔ میں یہاں سورۂ فتح کی آیت نقل کرتا ہوں:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ (الفتح:۲۸)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کی ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے اور (اس حقیقت پر) اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف کی آیتوں کا آخری ٹکڑا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ہے اور سورۃ الفتح کی آیت کا آخری ٹکڑا وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ دین حق کا غلبہ مشرکوں اور کافروں کو خواہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو ہم نے اپنے رسول کو اسی مقصد سے بھیجا ہے اور سورۃ الفتح کا آخری ٹکڑا یہ بتاتا ہے کہ بعثتِ محمدی کی اس غرض و غایت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اب اگر تمام دنیا مل کر بھی یہ کہے کہ محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ نہیں تھا تو اس کی بات قابل سماعت نہ ہوگی۔ سورۃ التوبہ آیت ۳۳ کے تحت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے:

''دین کا لفظ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، عربی زبان میں اس نظام زندگی یا طریق زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ پس بعثت رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دین حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کردے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی کہ جو نظام زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظام زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب ہو کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے بلکہ وہ بادشاہِ ارض و سما کا

نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظام زندگی دنیا میں رہے بھی تو اسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد ۲، حاشیہ ۳۲، ص ۱۹۰)

حضورؐ کے اس مقصد بعثت کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور ''ازالۃ الخفاء'' میں بار بار متعدد مقامات پر لکھا ہے۔ اس آیت کا حوالہ دیے بغیر بھی لکھا ہے اور یہ آیت پیش کر کے بھی لکھا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے اللہ کی یہ سنت پیش کی ہے کہ کس طرح وہ باغی اور سرکش قوموں کو مغلوب اور تباہ کرتا رہتا ہے۔ اسی سلسلۂ بیان میں انھوں نے حضورؐ کے مقصدِ بعثت اور ادیانِ باطلہ کی مغلوبیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''و آں وضع خاص ظہور دین ایشان است بر ادیان ہمہ آں در ضمن کتب حامیان ادیان و داعیان آنہا بقتل و سبی و نہب و اخذ خراج و جزیہ و ازالہ دولت و شوکت ایشاں و پائمال و بے مقدار ساختن ایشاں و ایں وضع خاص در اصل بعثت آں حضرتؐ ملفوف شد و بعثت آں جناب متضمن آں صورت گشت فذلک قولہ تعالیٰ هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دين الحق ليظهره على الدين كله و لو كره المشركون و قوله صلى الله عليه وسلم انما بعثتک لابتليك و ابتلي بک (ازالۃ الخفاء مقصد اول ص ۴۵، مطبع صدیقی)

''اور وہ خاص وضع و شکل آپ کے دین کو دوسرے ادیان پر غالب کرنا ہے۔ اس طریقے پر کہ ان ادیان باطلہ کے حامیوں اور داعیوں کو قتل اور قید کیا جائے ان سے خراج اور جزیہ وصول کیا جائے ان کی حکومت و شوکت کو ختم اور ان کو پامال و ذلیل کیا جائے، اور یہ وضع خاص آپ کی اصل بعثت کے اندر داخل اور آں حضورؐ کی بعثت اس خاص صورت پر مشتمل تھی اور یہی مطلب ہے اس آیت کا ''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ اور یہی مطلب ہے حضورؐ کی اس حدیث قدسی کا کہ میں نے تم کو اس لیے بھیجا ہے کہ تمھیں آزماؤں اور تمھارے ذریعے دوسرے لوگوں کی آزمائش کروں۔''

اسی آیت پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے:

''جان لینا چاہیے کہ اس آیت کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ ہر غلبہ جو دین حق کو حاصل ہوا وہ سب کا سب ليظهره على الدين كله میں داخل ہے اور وہ عظیم الشان غلبہ جو کسریٰ و قیصر کی حکومتوں کو درہم برہم کر دینے کی شکل میں حاصل ہوا بدرجہ اولیٰ اس کلمہ میں داخل ہے اور بڑے درجے و مرتبے

کے علم بردار خلفاء تھے (رضی اللہ عنہم) ان بزرگوں کی کوششیں آں حضرتؐ کی بعثت کا مقتضا اور اس کے اندر داخل تھیں۔(ازالۃ الخفاء، جلد ا، ص ۲۶)

بعض وہ لوگ جو غلبۂ دین حق سے مایوس ہیں یا اس کی جدوجہد سے جان بچانا چاہتے ہیں اس آیت کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ حضورؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب ہم اس جدوجہد کے مکلّف نہیں ہیں۔ ان کی اس ذہنیت کا جواب بھی شاہ صاحب کی تحریر میں موجود ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور دین حق آں حضرتؐ پر نازل فرمایا اور آپؐ نے صحابہ کرام کو اس کی تبلیغ کی۔ صحابہ نے آپ کے مقصد و مراد کو اچھی طرح سمجھا اور پھر اسے تابعین تک پہنچایا اور اسی طرح عہد بہ عہد وہ مقصد منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اس لیے کہ ارادۂ الٰہی محض یہ نہ تھا کہ صرف آں حضرتؐ کو تعلیم دے دی جائے اور نہ یہ تھا کہ سننے والے مقصدِ تبلیغ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ آپؐ عہدۂ تبلیغ سے عہدہ برآ ہو جائیں بلکہ مراد دین حق کا ظہور اور غلبہ ہے۔ قرناً بعد قرنٍ (یعنی ایک زمانے کے بعد دوسرے زمانے میں اور پھر تیسرے میں اور اسی طرح)۔''(ازالۃ الخفاء، جلد ا، ص ۴۶)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' میں متعدد ابواب میں اور مختلف انداز سے بار بار یہ حقیقت دہرائی ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو اقامتِ دین ہی کے لیے مبعوث فرماتا رہا ہے اور اس نے سیدنا محمد ﷺ کو بھی اسی لیے مبعوث فرمایا تھا کہ وہ دین حق کو باطل ادیان پر غالب کریں۔ ابواب الایمان کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

اعلم ان النبیﷺ لما کان مبعوثا الی الخلق عاما لیغلب دینه علی الاَدیان کلها بعز عزیز و ذل ذلیل حصل فی دینه انواع من الناس فوجب التمییز بین الذین یدینون دین الاِسلام و بین غیرهم الخ (حجۃ اللہ البالغہ، ج ا، ص ۱۶۲، مطبوعہ مصر)

''جان لو کہ نبیﷺ چوں کہ تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں تا کہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیں، عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ اس لیے آپ کے دین میں مختلف قسم کے لوگ داخل ہو گئے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تمیز کی جائے۔''

ایک جگہ وہ جہاد کی ضرورت و فضیلت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعلم ان النبیﷺ بعث بالخلافة العامة و غلبة دینه علیٰ سائر الادیان لا یتحقق الّا بالجهاد و اعداد الالٰة فاذا ترکوا الجهاد واتبعوا اذناب البقر احاط بهم الذل وغلب اهل سائر الاَدیان.

(حجۃ اللہ البالغہ۔ج ۲،ص ۷۳)

''جان لو کہ نبی ﷺ خلافت عامہ کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور آپ کے دین کا دوسرے تمام ادیان پر غالب ہونا جہاد اور سامان جہاد کی تیاری کے بغیر ممکن نہیں ہے تو جب وہ جہاد ترک کر دیں اور بیلوں کی دموں کے پیچھے لگ جائیں (یعنی وہ صرف حصولِ معاش میں مشغول اور جہاد سے غافل ہو جائیں) تو ذلت ان کو گھیر لے گی اور دوسرے ادیان والے ان پر غالب آ جائیں گے۔''

ہم طوالت کے خوف سے اس طرح کی دوسری عبارتیں نقل نہیں کر رہے ہیں، جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں ان سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے پورے عزم اور یقین کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت کا مقصد دین حق کو تمام ادیان پر غالب کرنا تھا۔ ہم مسلمانوں کے لیے اقامتِ دین کے فرض و واجب ہونے کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہم جس رسول کی امت ہیں ان کی بعثت کا مقصد ہی اقامت دین تھا۔

تیسری دلیل

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جس ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرماتا تھا اس کا ماخذ اور سرچشمہ وہ کتابیں ہوتی تھیں، جو ان پر نازل کی جاتی تھیں اور دین حق کو ادیان باطلہ پر غالب کرنے اور اسے قائم کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب برحق کو قائم اور نافذ کیا جائے۔ ان کتابوں کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسان نے ظلم و زیادتی اور اپنی خواہشات نفس کے تحت دین میں جو اختلافات پیدا کر دیے ہیں، انھیں دور کیا جائے۔ اس نے شرک اور کفر و معصیت کا جو نظام قائم کر دیا ہے اس کو ختم کر کے از سر نو توحید اور ایمان و اطاعت کا نظام قائم کیا جائے اور اسے تاریک وادیوں سے نکال کر دین حق کی سیدھی اور روشن شاہراہ پر واپس لایا جائے۔ ان کتابوں کی حیثیت سلطان کائنات کے فرامین کی تھی جن پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا رسولوں پر بھی فرض تھا اور ان لوگوں پر بھی جن کی ہدایت کے لیے وہ مبعوث کیے گئے تھے۔ رسول آتے

رہے اور کتابیں اُترتی رہیں یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ اب اللہ کا آخری رسول اور نبی مبعوث ہو اور اس کی آخری کتاب نازل ہو۔ اللہ کے وہ آخری نبی اور رسول سیدنا محمد ﷺ ہیں اور اس کی آخری کتاب 'قرآن مجید' ہے۔ اب قیامت تک یہی کتاب حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی ہے اور یہی وہ فرقان ہے، جس کے احکام تمام بنی نوع انسان کے لیے واجب التعمیل ہیں۔ جب توریت نازل ہوئی تھی تو اس کی اقامت کا نام اقامت دین تھا اور جب انجیل نازل ہوئی تھی تو اس کی اقامت کا نام بھی اقامت دین تھا اور اب قیامت تک قرآن کی اقامت کا نام بھی اقامت دین ہے۔ خود قرآن نے اہلِ کتاب کے بارے میں کہا ہے:

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (المائدۃ:۶۶)

''اور اگر وہ توریت وانجیل اور جو کچھ ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے قائم رکھتے تو رزق ان کے اوپر سے برستا اور نیچے سے اُبلتا۔''

اس آیت میں توریت وانجیل کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل کتاب راست بازی کے ساتھ اس دین کی پیروی پر قائم رہتے، جو توریت وانجیل اور دوسری آسمانی کتابوں میں ہے اور اسے اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے رہتے تو اس دنیا میں بھی رزق ہر طرف سے ان پر برستا اور اُبلتا۔۔۔ پھر اسی سورہ میں آگے آیت ۶۸ میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے جو بات کہی گئی ہے اس پر غور کیجیے کہ صرف انھیں کے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی کتنی اہم ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (المائدۃ:۶۸)

''کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم کسی راہ پر نہیں ہو یہاں تک کہ تم توریت وانجیل کو قائم کرو اور اس کو قائم کرو، جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے۔''

بہت سے مفسرین کے نزدیک وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ سے مراد قرآن عظیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہلِ کتاب سے جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک تم توریت وانجیل وقرآن کی اقامت نہ کرو اس وقت تک تم دینی و مذہبی لحاظ سے کچھ نہیں ہو اور تمھاری دینی زندگی صفر اور لاشئے محض ہے۔ کھلی بات ہے کہ توریت وانجیل اور اس کے بعد جب قرآن نازل ہوا تو اس پر ایمان لا کر اس کی

اقامت یعنی اس کے تمام احکام کی مخلصانہ پیروی ان پر فرض ہے اور اسی فریضے کو ترک کرنے کی وجہ سے ان کی دینی زندگی لاشئے محض ہوگئی ہے۔ اگر ان پر کتاب اللہ کی اقامت فرض نہ ہوتی تو انھیں لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ (تم کسی راہ پر نہیں ہو) کہنا کسی طرح صحیح نہ ہوتا۔ دیگر دلائل کے علاوہ یہ آیت بھی اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ جو شخص بھی اللہ کی کتاب پر ایمان کا مدعی ہو اس پر اس کتاب کی اقامت فرض ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا، اب قیامت تک اقامت قرآن ہی کا نام اقامتِ دین ہے۔

چند اور آیتیں

سورۃ المائدہ کی ان دو آیتوں میں خطاب اہلِ کتاب سے تھا، ان کے علاوہ عمومی اور کلی انداز میں تمام آسمانی کتابوں کے نزول کی غرض و غایت سے متعلق قرآن مجید میں بیسیوں آیتیں موجود ہیں۔ ہم دو آیتیں اور ان کا ترجمہ یہاں نقل کرتے ہیں:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ○ (البقرۃ: ۲۱۳، ۲۱۴)

''ابتدا میں تمام انسان ایک ہی دین و ملت پر تھے۔ (پھر ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا) تب اللہ نے اپنے نبی بھیجے، جو بشارت اور ڈراوا سنانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں ان کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوگئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایت پالینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لائے انھیں اللہ نے اپنے اذن سے حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔ پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالاں کہ ابھی تم پر

وہ سب نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں، اللہ کی مدد قریب ہے۔''

ان دو آیتوں سے مندرجہ ذیل چار باتیں بہ وضاحت معلوم ہوتی ہیں:

(الف) دنیا میں بنی نوعِ انسان نے اپنا سفر حیات حق کی روشنی میں شروع کیا تھا، حق کا علم پا لینے کی وجہ سے انسانی گروہ عرصۂ دراز تک ایک ہی ملت اور ایک ہی امت بنا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ کچھ خود غرضوں کی نفسانیت، ایک دوسرے پر زیادتی اور ذاتی مفاد کے جھگڑوں نے وحدت ملت کو پارہ پارہ کر دیا اور دین حق میں اختلافات پیدا کر دیے، لیکن اللہ تعالیٰ چوں کہ رحمان و رحیم ہے اس لیے اس نے انسانوں کو تباہ و برباد ہونے کے لیے بے سہارا نہ چھوڑا بلکہ ان کی اصلاح و فلاح کے لیے اپنے برگزیدہ بندے مبعوث کیے۔

(ب) تمام انبیاء اور رسولوں کے ساتھ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب برحق بھی ہوتی تھی، جو عقائد و اعمال کے تمام اختلافات و نزاعات کے لیے قاضی اور حاکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ انبیاء صرف اسی لیے نہیں بھیجے جاتے تھے کہ خوش خبری اور ڈراوا سنا دیں بلکہ انھیں کتاب برحق دے کر اس بات پر بھی مامور کیا جاتا تھا کہ وہ تمام اختلافات کو مٹا کر لوگوں کو پھر اسی دین حق پر جمع کر دیں، جس میں اختلاف پیدا کر کے وہ الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ زندگی کا کوئی معاملہ بھی ہو صرف اس کتاب کو یہ حق ہوتا تھا کہ وہ اس کے صحیح یا غلط، حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کرے۔

(ج) سیدنا محمد ﷺ پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے بتایا گیا ہے کہ اگلی امتوں نے اپنے وقت کے رسولوں اور خدا کی کتابوں کو اپنا قاضی و حاکم آسانی سے تسلیم نہیں کیا اور یہ راہ پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی۔ یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ تم سے پہلے کے داعیانِ حق نے اس راہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں اور دشمنانِ حق کے نرغے میں اس طرح ہلا مارے گئے ہیں کہ اہل ایمان کے ساتھ وقت کے رسول تک چیخ اُٹھے ہیں۔ پھر تم کس بنا پر توقع رکھ سکتے ہو کہ جو کچھ تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے وہ تم پر نہیں گزرے گا۔

(د) اللہ کے باغیوں سے کش مکش اور کتابِ برحق کی اقامت کی تنفیذ کی تمام سعی و جہد کا مقصود دخول جنت کا استحقاق ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کے ٹکڑے سے ایک

بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد میں جان کھپانے والوں کا محرک عمل اور اصل مطمح نظر اللہ کی خوش نودی اور جنت کا حصول ہے۔ اور دوسری یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جنت کا حصول اقامت دین کے ساتھ وابستہ ہے، خدا کے نازل کردہ قانون پر لوگوں کو جمع کرنے کی جدوجہد سے دامن کشی کے باوجود رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کی توقع صحیح نہیں ہے۔

اللہ کے بھیجے ہوئے تمام احکام کی پیروی اور انھیں نافذ کرنے کے لیے سیاسی طاقت ضروری ہے، اس کا واضح اشارہ ذیل کی آیت میں کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحدید:۲۵)

’’ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اور ان پر ہم نے لوہا اُتارا اور اس میں سخت جنگ کا سامان ہے اور لوگوں کے لیے اس میں کچھ دوسرے فائدے ہیں اور اس لیے کہ اللہ جان لے کہ بن دیکھے کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور زبردست ہے۔‘‘

اس آیت میں کتاب اور میزان بھیجنے کی غرض و غایت یہ بیان کی گئی ہے کہ ظالم انسان ظلم کی روش ترک کر کے عدل و انصاف کی روش پر قائم ہو جائیں لیکن ظلم و جور کا استیصال اور عدل و انصاف کا قیام قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے آیت کے دوسرے ٹکڑے میں لوہے کی تخلیق کے تین اغراض بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے آلات حرب اور سامانِ جنگ تیار کیے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس کے علاوہ کچھ دوسرے منافع بھی ہیں اور تیسری غرض یہ ہے کہ اس قوت سے اللہ کے دین کی مدد کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی کتابیں جس عدل کو قائم کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں اس کو قائم کرنے اور باقی رکھنے کے لیے قوت اور اقتدار ضروری ہے۔ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ کے تحت علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

فیه اشارة الی احتیاج الکتاب والمیزان الی القائم بالسیف لیحصل القیام بالقسط فان الظلم من شیم النفوس.

(روح المعانی، جلد ۲۷، ص ۱۸۸، مطبوعہ مصر)

’’یہ اشارہ ہے اس بات کا کہ کتاب و میزان با اقتدار حاکم کے محتاج ہیں تاکہ عدل کا قیام ممکن ہو سکے کیوں کہ بہت سے انسان ظلم کو اپنی عادت و خصلت بنا لیتے ہیں۔‘‘

ظاہر ہے کہ اللہ کی کتاب بذاتِ خود عدل قائم نہیں کرسکتی بلکہ وہ حکومت قائم کرسکتی ہے، جو اس پر ایمان لائی ہو۔ یہی بات حافظ ابن کثیرؒ نے سورۂ حدید کی اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے لکھی ہے:

لابد مع الحق من قھر لمن عاداہ ونأواہ (تفسیر ابن کثیر، مطبوعہ مصر، ج ۳، ص ۵۹)

''حق کے دشمنوں اور مخالفوں کی سرکوبی کے لیے قہر وغلبہ ضروری ہے۔''

اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ:

ان اللّٰہ لیزع بالسلطان مالاَ یزع بالقراٰن (تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۵۹)

''بے شک اللہ تعالیٰ اقتدار کے ذریعے ان چیزوں کا سد باب کردیتا ہے، جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا۔''

کھلی بات ہے کہ قرآن خود کسی ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا، کسی زانی کی پیٹھ پر کوڑے نہیں برسا سکتا اور کسی چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ اس کے احکام کی تنفیذ کے لیے حکومت کا اقتدار ضروری ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت بذاتِ خود مقصود ومطلوب نہیں ہے بلکہ اس قانون کو نافذ کرنے کے لیے مطلوب ہے، جو اللہ نے انسانوں کی دنیوی واُخروی فلاح کے لیے نازل فرمایا ہے اور یہیں سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو حکومت طلب کرنے کی دعا کیوں سکھائی تھی۔ اس موقعے پر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۰ اور اس کی تفسیر کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔

چوتھی دلیل

سورۃ المائدہ رکوع ۷ میں توریت نازل کرنے، انبیاء بنی اسرائیل اور ان کے علماء وفقہاء کے مطابقِ توریت فیصلوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ۝ (المائدہ:۴۴)

''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔''

پھر آیت ۴۵ میں توریت کے قانون قصاص کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (المائدہ:۴۵)

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔''

آیت ۴۶ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور نزول انجیل کا ذکر کر کے آیت ۴۷ میں

کہا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○ (المائدہ:۴۷)

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔''

یہ آیتیں ایک طرف اس بات کی محکم دلیل ہیں کہ تمام معاملات ومقدمات میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا اس درجے کا فرض ہے کہ اس پر عمل نہ کرنے والا کافر، ظالم اور فاسق ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ اس حقیقت کی بھی پختہ دلیل ہیں کہ دین میں معاملات کی اہمیت عبادات سے کم نہیں ہے اور دین کا وہ جز جس کا تعلق سیاست وحکومت سے ہے اُتنا ہی اہم اور ضروری ہے جتنا وہ جز جس کا تعلق اللہ کی پرستش سے ہے۔ اور تیسری طرف یہ آیتیں اس بات کی بھی شاہد عدل ہیں کہ اقامت دین، حکومت وعدالت کی کرسیوں پر اتنی ہی ضروری ہے جتنی مسجد کی صفوں اور چٹائیوں پر ـــ البتہ یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں اور ہر صورت کا حکم الگ ہے۔ میں اس کی توضیح تفہیم القرآن سے نقل کرتا ہوں۔

> ''جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر ظالم اور فاسق ہے اور جو اعتقاداً حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگر چہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم الٰہی سے انحراف اختیار کر لیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور کفر وظلم وفسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے، جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔''
>
> (تفہیم القرآن: ج۱، ص۴۷۶)

بعض لوگ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ کافر، ظالم اور فاسق تو ان اہل کتاب کو کہا گیا ہے، جو توریت وانجیل کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔ ان آیتوں میں مسلمانوں کو خطاب نہیں کیا گیا ہے۔ اس شبہے کا جواب خود ان آیتوں میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے لوث قانون عدل میں بھی موجود ہے اور صحابہ وتابعین کی توضیحات میں بھی۔

ان آیتوں میں اس کا یہ جواب موجود ہے کہ ہر جگہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے) کے عام الفاظ کہے گئے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ''جو

توریت کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔'' اور'' جو انجیل کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ فاسق ہے'' بلکہ الفاظ عام رکھے گئے ہیں، جو قرآن کے مطابق فیصلہ نہ کرنے پر بھی بدرجہ اولیٰ صادق آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بے لوث عدل کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں سے اس کا کوئی خاص رشتہ نہیں ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کو توریت و انجیل کے مطابق فیصلہ نہ کرنے پر کافر، ظالم اور فاسق قرار دے اور مسلمانوں کو قرآن کے مطابق فیصلہ نہ کرنے پر مومن، عادل اور اطاعت گزار قرار دے۔

صحابہ و تابعین کی توضیحات میں یہ جواب موجود ہے کہ انھوں نے ان آیتوں کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے۔ ایک بار حضرت علقمہ و مسروق نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے رشوت کا حکم دریافت کیا۔ انھوں نے کہا وہ حرام ہے۔ ان دونوں نے دوسرا سوال یہ کیا کہ اگر کسی معاملے کا فیصلہ کرنے میں رشوت ستانی ہو تو؟ انھوں نے جواب دیا یہ کفر ہے اور وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ کی تلاوت کی۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۱۶) اور امام شعبیؒ تو یہ کہتے تھے کہ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ والی آیت مسلمانوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ غالباً انھوں نے یہ شدت اس لیے اختیار کی ہوگی کہ کہیں مسلمان اپنے آپ کو اس حکم سے خارج نہ سمجھنے لگیں۔ ایک بار کسی نے حضرت حذیفہؓ سے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لیے۔ ہرگز نہیں، خدا کی قسم تم انھی کے طریقے پر قدم بقدم چلو گے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۴۷۶)

ان تین آیتوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم نے تم پر جو کتاب برحق نازل کی ہے تم خدا کے نازل کردہ اسی قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ پھر آیت ۴۹ میں قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کا دوبارہ حکم دینے کے بعد یہ بھی کہا گیا ہے:

وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (المائدہ:۴۹)

''اور ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت کے کسی حکم سے بھی منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔''

آیت کا یہ ٹکڑا ہمارے لیے قابل غور ہے اس میں قرآن کے بعض احکام سے انحراف کو پوری تاکید کے ساتھ روک دیا گیا ہے۔ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کے نازل کردہ قانون کی مکمل پیروی کی جائے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ دشمنان حق اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اگر وہ مومن کو قرآن سے بالکلیہ منحرف نہیں کر سکتے تو کم سے کم اس کے بعض احکام ہی سے منحرف کر دیں۔ آگے کہا گیا ہے:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ○ (المائدۃ:۵۰)

”(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔“

اس آیت کے تحت ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ چنگیز خاں نے اپنی حکومت کے لیے جو مجموعہ احکام تیار کیا تھا وہ اس کے خاندان کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی نافذ رہا۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

> ”یہ مجموعہ احکام اب اس کے خاندان کے مسلمان سلاطین و حکام کے نزدیک وہ اصل شریعت ہے، جس کی وہ اتباع کرتے ہیں۔ اس مجموعے کے احکام کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے احکام پر مقدم رکھتے ہیں اور جو ایسا کرے وہ کافر ہے۔ اس سے اس وقت تک مقابلہ واجب ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف پلٹ نہ آئے اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں انھیں کے مطابق فیصلہ نہ کرنے لگے۔“ (تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۶۷)

پانچویں دلیل

یہ ہے اقامت دین کا وہ مطالعہ اور وہ مفہوم، جو قرآن ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ، راستوں کا امن اور انسانی اخلاق و کردار کو بگاڑ سے بچانے کا اہتمام، ایک مہذب انسانی معاشرے کے لیے جس قدر ضروری ہے اس سے ہر صاحب فہم انسان واقف ہے۔ ان تحفظات کے بغیر نہ انسانی نفس کی تکمیل آسان ہے، نہ صالح اجتماعیت کی بقا ممکن ہے اور نہ انسانیت کا اپنے معراج کمال تک ترقی کرنا سہل ہے۔ بلاشبہ اسلام جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے اور موت کے بعد دوسری زندگی اور آخرت کے ابدی عذاب و ثواب کی جس حقیقت کو انسانی دل و دماغ میں پیوست کرتا ہے وہ ان تحفظات کی اصل ضمانت ہیں۔ لیکن محض عقائد سے ظلم و جور اور برائیوں کا استیصال ممکن نہیں، ہے اس لیے اس نے عقائد کے ساتھ ان تحفظات کے حصول کے لیے حدود و تعزیرات بھی مقرر کی ہیں

اور امن و امان کو باقی رکھنے اور جرائم کا انسداد کرنے کے لیے قوانین بھی دیے ہیں اور جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے اس نے ان حدود و قوانین کی تنفیذ کو عبادات کی ادائی سے کم اہمیت نہیں دی ہے۔ اس لیے جب تک ان حدود و قوانین کی تنفیذ نہ ہو اقامتِ دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ حکومت و سیاست کے باب سے متعلق قرآن مجید میں بہت سے احکام دیے گئے ہیں۔ میں یہاں ان میں سے صرف دو حکم پیش کرتا ہوں۔ چور کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم اور زانی کی پیٹھ پر کوڑے لگانے کا حکم۔

سورۃ المائدہ میں چور کی سزا کا حکم دینے سے پہلے قُطّاع الطریق یعنی رہزنوں کی سزا بیان کی گئی ہے۔ میں پہلے وہ آیات اور ان کا ترجمہ یہاں نقل کرتا ہوں تاکہ رہزنوں اور چوروں کی سزاؤں کے درمیان مناسبت کا احساس تازہ ہو جائے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَ اَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (المائدۃ:۳۳، ۳۴)

’’جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ لیے جائیں یا جلاوطن کر دیے جائیں، یہ ذلت اور رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ ان پر قابو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

یہ سزا رہزنوں اور ڈکیتوں کی بھی ہے۔ اسلامی حکومت کے باغیوں اور اس نظام کو اُلٹنے کی سعی کرنے والوں کی بھی ہے اور بعض علماء کے نزدیک مرتدوں کی بھی ہے۔ ان سزاؤں کی تفصیل اور فقہی احکام و مباحث پیش کرنا اس وقت میرے موضوع سے خارج ہے۔ ان آیتوں کے بعد چوروں کے بارے میں جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

وَ السَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا جَزَآءً ۢبِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ

اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ○ (المائدۃ:۳۸)

''اور چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا اور اللہ غالب اور دانا و بینا ہے۔''

سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ○ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّلَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَلۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○ (النور:۱،۲)

''یہ ایک سورہ ہے، جس کو ہم نے نازل کیا ہے اور اسے ہم نے فرض کیا ہے اور اس میں ہم نے صاف صاف ہدایات نازل کی ہیں۔ شاید تم سبق لو۔ زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔''

اس سورہ کی پرزور تمہید میں یہ بات پوری وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے کہ اس میں جو احکام دیے جا رہے ہیں وہ فرض ہیں اور جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر ان احکام کی تعمیل واجب اور لازم ہے۔ اس کے بعد فوراً ہی زانیہ عورت اور زانی مرد کو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ان حدود کو نافذ کریں۔

سورۂ مائدہ اور سورۂ نور کی ان آیتوں میں امت مسلمہ بحیثیت مجموعی مخاطب ہے لیکن حد نافذ کرنا حکومت کا کام ہے کیوں کہ ہر شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت دے دی جائے تو سخت افراتفری پھیل جائے اور اجتماعیت منتشر ہو کر رہ جائے۔ ان حدود کو مسلمانوں کی نیابت میں ان کے حکام نافذ کریں گے۔ مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ جہاں ان کی حکومت قائم ہو وہ وہاں یہ دیکھتے رہیں کہ قرآن و سنت میں مقرر کی ہوئی حدود و تعزیرات نافذ ہو رہی ہیں یا نہیں؟ اگر نافذ ہو رہی ہوں تو اپنی حکومت کو انھیں نافذ کرنے پر مجبور کریں گے اور اگر وہ تیار نہ ہو تو اسے بدل دینے کی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اور اگر کسی ملک میں کوئی ایسا سیاسی اقتدار موجود ہی نہ ہو، جو قرآن کے ان حدود کی تنفیذ کر سکے تو دعوت اسلامی کے اوّلین مرحلے سے لے کر آخری مراحل تک ایک ایسے سیاسی اقتدار کے حصول کی جدوجہد واجب ہو گی۔

چھٹی دلیل

قرآن کریم کی وہ آیت، جس سے اقامت دین کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرَاهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ (الشوریٰ: ۱۳)

''تمہارے لیے وہ آئین مقرر کیا، جس کی اقامت کا حکم دیا تھا نوح کو اور جس کے لیے ہم نے وحی بھیجی ہے تمہاری طرف اور جس کی اقامت کا ہم نے حکم دیا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کہ قائم کرو دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو۔''

ہم نے یہاں جو ترجمہ دیا ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فارسی ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے۔ انھوں نے اس آیت کا فارسی میں جو ترجمہ کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

''مقرر کرد برائے شما از آئین انچہ امر کردہ بود با قامت آں نوح را وانچہ وحی فرستادیم بسوئے تو وانچہ امر کردیم با قامت آں ابراہیم، موسیٰ وعیسیٰ بایں مضمون کہ قایم کنید دین را و متفرق مشوید در آں۔'' (فارسی ترجمہ قرآن شاہ ولی اللہؒ)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اس ترجمہ میں دو باتیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے دین کا ترجمہ ''آئین'' کیا ہے اور دوسری یہ کہ انھوں نے اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کا ترجمہ کیا ہے ''قائم کرو دین کو۔'' اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا وہ انسانی زندگی کا آئین و قانون تھا جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی دنیوی واخروی فلاح کے لیے نازل کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے کہ ''اقامت دین'' کی اصطلاح ایک ایسی جامع کلی ہے، جس نے دین کی تمام کلیات و جزئیات کا احاطہ کر لیا ہے۔ یہ بات گزشتہ صفحات میں واضح کی جا چکی ہے کہ حضرت آدم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام خلافت الٰہی کے عظیم منصب پر فائز تھے۔ شاہ صاحب نے خلافت کی تعریف اور اس کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ملت محمدیہ میں یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ جب آں حضرت ﷺ اللہ کی تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیے گئے تو آپ نے ان لوگوں کے ساتھ جن کی طرف مبعوث کیے گئے تھے بہت سے معاملات و تصرفات کیے اور ہر معاملے کے لیے آپ نے اپنے نائبین مقرر کیے اور تمام معاملات کی انجام دہی میں بے حد اہتمام فرمایا۔ جب ہم ان معاملات کا جائزہ لیتے ہیں

اور جزئیات سے کلیات کی طرف اور کلیات سے کسی ایسی کلی کی طرف منتقل ہوتے ہیں، جو سب کو حاوی و شامل ہو تو اس واحد کلی کی جنس اعلیٰ ''اقامت دین'' قرار پاتی ہے، جو تمام کلیات کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے تھے اور اس جنس اعلیٰ کے تحت دوسری اجناس ہیں۔''

(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، ج ۱ ص ۲۱)

اپنے زمانے کی علمی و منطقی زبان میں حضرت شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے بحیثیت نبی بہت سے کام انجام دیے ہیں ان میں سے بہت سے امور اصول اور قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص ان تمام امور و معاملات کو کسی ایک اصطلاح میں جمع کرنا چاہے تو وہ اصطلاح ''اقامت دین'' ہی ہوگی، جس شخص کی بھی احادیث، تفسیر، فقہ، تاریخ اور پورے اسلامی لٹریچر پر نظر ہوگی وہ شاہ صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرے گا کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد صحابہ سے لے کر آج تک تمام علمائے امت دین اسلام کی ترویج و تنفیذ کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔

''اقامت دین'' کی جامع اصطلاح کے تحت جو امور و معاملات اور کلیات و جزئیات داخل ہیں ان میں سے دو اصولی امور کا ذکر شاہ صاحب نے کیا ہے:

''ان میں سے ایک علوم دینیہ کی اشاعت، قرآن و سنت کی تعلیم اور تذکیر و موعظت ہے۔ قالَ اللّٰہِ تَعَالٰی هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲) (وہی ہے جس نے امیوں میں انھیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) اور یہ بات معلوم ہے کہ آں حضرت ﷺ اپنے صحابہ کو نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ دوسری چیز ارکانِ اسلام کی اقامت ہے، اس لیے کہ یہ بات بھی معلوم و معروف ہے کہ آپ جمعہ، عیدین اور پنج وقتہ نمازوں کی اقامت خود کرتے تھے اور ہر مقام پر ائمہ کا تقرر فرماتے تھے، تحصیل زکوۃ کے لیے اپنے عمال بھیجتے اور زکوۃ کو اس کے مصارف میں خرچ کرتے، اسی طرح رمضان اور عید کی رویت ہلال کی شہادت سماعت فرماتے اور ثبوت شہادت کے بعد صوم و فطر یعنی روزہ رکھنے اور اسے ختم کرنے کا حکم دیتے۔ آپ نے بہ نفس نفیس حج کی امامت کی (یعنی اپنی قیادت و امامت میں لوگوں کو فریضہ حج ادا کرایا) اور ۹ھ میں آپ حج کے لیے تشریف نہ لے جاسکے تو حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج مقرر فرمایا تا کہ وہ حج کی اقامت کریں، اسی طرح جہاد کی اقامت، اُمراء کا تقرر، جہاد کے لیے فوجوں اور فوجی دستوں کو

بھیجنا، خصومت اور نزاع میں فیصلے کرنا اور بلاد اسلامی میں قاضیوں کو مقرر کرنا، شرعی حدود کو نافذ کرنا، معروف کا حکم دینا، منکر سے روکنا، ان کے درجات معروف و معلوم ہیں۔ محتاج بیان نہیں ہیں۔ پھر جب آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے تو اقامت دین اسی تفصیل کے ساتھ جو اوپر گزری، آں حضرت ﷺ کے بعد کے لوگوں پر واجب ہوئی۔

(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، ج ۱، ص ۳)

شاہ صاحب کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے تعلیم قرآن وسنت اور تذکیر و موعظت کی مجلسوں سے لے کر بدر وحنین اور خیبر وتبوک کے میدانوں تک اور تبلیغ دین سے لے کر انتظام مملکت تک جو کام بھی کیا وہ سب اقامت دین میں داخل تھا اور اس کا کوئی جزو دین اسلام سے خارج نہ تھا۔

شریعتوں کے درمیان اختلاف محض جزوی تھا

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس سے معلوم ہوا کہ اقامت دین انبیائے کرام علیہم السلام پر فرض تھا اور سیدنا محمد رسول اللہؐ کے بعد آپ کی امت پر اسی تفصیل کے ساتھ فرض رہی، جس تفصیل کے ساتھ آپ پر فرض تھی۔ اب، یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی شریعتوں میں اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟ اِسے واضح کرنے کی ضرورت اس شبہے کی وجہ سے پیش آتی ہے کہ اقامت دین کی آیت میں پانچ انبیاء اولوالعزم، حضرت نوح وابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ ومحمد صلوات اللہ علیہم اجمعین کے نام لے کر انھیں اقامت دین کا حکم دیا گیا ہے۔ اب اگر دین کی اقامت میں شریعت کی اقامت کو بھی داخل مانا جائے تو یہ بات صحیح نہ ہوگی۔ اس لیے کہ شریعتیں مختلف رہی ہیں۔ اس شبہے کو دور کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے ایک مستقل باب میں سورۃ الشوریٰ کی زیر بحث اَقِیْمُوا الدِّیْنَ والی آیت نقل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جس دین کی اقامت کا حکم دیا گیا تھا اس میں کون کون سی چیزیں ہمیشہ داخل رہی ہیں اور یہ کہ شریعتوں کے مختلف ہونے کا مطلب کیا ہے اور اختلاف کی نوعیت کیا رہی ہے؟ انھوں نے اصل دین کی جس پر تمام انبیاء کرام متفق رہے ہیں۔ توضیح کرتے ہوئے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق عقیدے اور دوسرے عقائد کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اعمال صالحہ میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج کے فرائض اور دعا، ذکر، تلاوت کتاب اللہ اور دوسرے نوافل بیان کیے ہیں۔ عقائد اور ان اعمال کی تفصیل کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی اپنی عبارت میں یہ ہے:

باب ہشتم :

جماعتِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی

(1) جماعتِ اسلامی کی خصوصیات

(2) تحریکِ اسلامی کا تعارف

(3) تحریکِ اسلامی کا طریقِ کار

(4) دعوت اور تنظیم

(5) اسلامی انقلاب کی جدو جہد

جماعت اسلامی کی بنیادی خصوصیات

جماعت اسلامی ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی۔ اس تنظیم نے برِصغیر کے علاوہ پوری دنیا کے مسلمان عوام وخواص پر اپنے اثرات ڈالے۔

جماعت اسلامی کے بنیادی لٹریچر کے مطالعے سے اِس جماعت کی پانچ بنیادی خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں:

(الف) ماضی کی تحریکاتِ اسلامی سے ہم آہنگی کا شعور

(ب) اُمّت کے ساتھ یک جہتی کا احساس

(ج) فرقہ بندی سے اجتناب

(د) شورائیت اور احتساب کی روایات کی تجدید

(ہ) اُمّتِ مسلمہ اور عالمِ انسانیت کے درمیان تعلق کی نشان دہی

ماضی کی اِسلامی تحریکات

جماعت اسلامی کا تاسیسی اجتماع لاہور میں ۱۹۴۱ میں منعقد ہوا۔ اُس وقت تک مُلک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ جماعت کے اس تاسیسی اجتماع میں جو پچہتر (۷۵) افراد شریک ہوئے، وہ پورے مُلک سے آئے تھے۔ جماعت کا جو دستور انھوں نے بنایا وہ ایک عالمی جماعت کا تھا۔ اِس دستور میں جماعت اسلامی کا دائرۂ کار کسی ایک مُلک تک محدود نہیں کیا گیا تھا۔ یوں تو تاسیسی اجتماع کے تمام شرکاء کو جماعت کا بانی کہا جاسکتا ہے، لیکن اُن میں کلیدی شخصیت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ مولانا نہ صرف اِس اجتماع کے داعی تھے، بلکہ جماعت

کی بنیاد جن افکار وخیالات پر رکھی گئی، اُن کو ایک مرتب لٹریچر کی صورت میں پیش کرنے والے مفکر بھی تھے۔

مولانا مودودیؒ کی ایک اہم کتاب 'تجدید واحیائے دین' ہے۔ کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل یہ کتاب ماہ نامہ 'الفرقان' کے 'شاہ ولی اللہ نمبر' (۱۹۳۵) میں ایک مضمون کی شکل میں چھپ چکی تھی۔ محترم مصنف نے اِس کتاب میں اُن تحریکات کا اِجمالی تذکرہ کیا، جو خلافتِ راشدہ کے بعد مختلف ادوار میں اٹھیں اور انھوں نے اُمتِ مسلمہ کو دوبارہ اُس کے اصل مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ تجدیدی تحریکات کا یہ تذکرہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے شروع ہوتا ہے اور شاہ ولی اللہؒ پر ختم ہوتا ہے۔ اِن مجددین محترم کے کارناموں کے تعارف سے قبل مولاناؒ نے خود کارِ تجدید کا تعارف کرایا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے یہ بات واضح کی ہے کہ کارِتجدید کا اصل منشا جاہلیت کے تسلّط کو ختم کرنا ہے۔ یہ وہی کام ہے جو انبیاء علیہم السلام انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے نبی اور مجدد کے کام میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، اُس کی واضح نشان دہی کی ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ مجدد نبی تو نہیں ہوتا اِس لیے کہ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے، لیکن وہ اپنے مزاج میں مزاجِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ اِسے اللہ ایسی بصیرت عطا کرتا ہے کہ وہ حالات کا ٹھیک اندازہ لگا تا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اِس وقت جاہلیت کی گرفت کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اِس جائزے کے بعد وہ یہ سوچتا ہے کہ اب کِس جگہ ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور دین کے احیاء کے لیے راہ ہموار ہو۔

مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب 'تجدید واحیائے دین' میں جو تاریخی تجزیہ پیش کیا، وہ جماعت اسلامی کے قیام کے لیے پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے جس نئی جماعت کے قیام کی دعوت دی، اس کا کام اس کارِتجدید کا تسلسل ہے، جو امت کے ماضی کے اندر انجام پاتا رہا ہے۔ جماعت اسلامی کے وابستگان کو ماضی کے اِن تجربات سے حوصلہ حاصل کرنا ہے، بزرگوں کی قربانیوں کے اعلیٰ نمونوں سے اپنے جذبات کو جِلا دینی ہے، اُن کے اچھے اقدامات کی اپنے حالات کے مطابق پیروی کرنی ہے اور اُن کی لغزشوں سے بچنا ہے۔ یہ سارے کام اُس

وقت ہو سکتے ہیں، جب جماعت اسلامی کے کام کو امت کی تاریخ کے اندر جاری تحریکاتِ تجدید کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جائے۔

جماعت اسلامی کے دستور میں عقیدۂ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح کے ذیل میں بنیادی اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اِن اصولوں میں ایک اہم اصول 'معیارِ حق' کی اِصطلاح کے متعلق ہے۔ جماعت کے فہم کے مطابق صحیح اسلامی رویّہ یہ ہے کہ یہ طے کرنے کے لیے کہ کون سا نقطۂ نظر اور رویّہ برحق ہے اور کون برسرِ حق نہیں ہے، صرف کتاب وسنت کو معیار بنایا جائے۔ اس اصول کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہے، جس کے کام کو کتاب و سنت کے معیار پر نہ پرکھا جا سکتا ہو۔ اِس اصول کا انطباق جس طرح حال کی شخصیات اور افراد پر ہوگا، اُسی طرح ماضی کی شخصیات پر بھی ہوگا۔ اگر ماضی کی تحریکاتِ تجدید اور مجددین کرام کے کارناموں سے فی الواقع فائدہ اٹھانا ہے تو اس اصول کا استعمال ضروری ہے۔

چنانچہ اس اصول کا استعمال کرتے ہوئے خود مولانا مودودیؒ نے ماضی کی تحریکات کا دیانت دارانہ جائزہ لیا ہے اور جہاں جہاں کمزوریاں اور لغزشیں محسوس ہوئیں، اُن کی صاف صاف نشان دہی کی ہے۔ اِس ضمن میں مولانا مودودیؒ نے ولی اللّٰہی تحریک اور تحریک شہیدین کے سلسلے میں تین باتوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کے سلسلے میں ان تحریکات کا مطالعہ کرنے والے ہر طالب علم کو فی الواقع تردد محسوس ہوتا ہے:

(الف) 'مغربی طاقتوں خصوصاً انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجوہ کیا ہیں اور اس طاقت کے پیچھے کون سے سماجی وتاریخی عوامل کارفرما ہیں' اِس امر کی کوئی تحقیق 'تحریک شہیدین' کے قائدین نے نہیں کی۔

(ب) مسلمانوں میں جاری روایتی تصوف کی کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود اِس تصوف کی رائج اِصطلاحات سے پرہیز نہیں کیا گیا، جب کہ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ جرأت کے ساتھ مروجہ تصوف میں اِصلاح کی جاتی۔

(ج) سرحد کے علاقے میں عملی اقدام کرنے سے قبل اُس علاقے کے عوام کو اِصلاحی انقلاب کے لیے تیار نہیں کیا گیا۔ گویا سماجی تبدیلی سے پہلے، قبل از وقت سیاسی اقدام کر دیا گیا۔

تجدید واحیائے دین کی سعی کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ماضی کی تجدیدی کوششیں اُن کے لیے نمونہ بھی ہیں، تاکہ اُن سے فائدہ اٹھایا جائے، لیکن جو غلطیاں ماضی کے کاموں میں نظر آئیں اُن سے انھیں بچنا بھی ہے۔

اُمّت سے تعلّق

اُمت کے ماضی سے تعلّق کے علاوہ اُمت کے حال سے تعلق کا اظہار بھی جماعت کے قیام کے دوران پیش کردہ امور سے ہوتا ہے۔ تاسیسی اجتماع میں مولانا مودودیؒ نے یہ پہلو واضح کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اِس نئی جماعت کے قیام کی دعوت دینے سے قبل انھوں نے مُلک میں موجود مسلمانوں کی اہم تنظیموں کو اصل اسلامی نصب العین یاد دِلایا اور اُن سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں کے وقتی مسائل کے حل کے لیے کام کرنے کے بجائے بنیادی اِسلامی نصب العین کے لیے کام کریں۔ اِسی طرح مولانا نے یہ اپیل بھی کی تھی کہ مسلمانوں کو مختلف وقتی مقاصد کی طرف بلانے کے بجائے مسلمانوں کی جماعتوں کو یہ چاہیے کہ وہ 'الھدیٰ' اور دینِ حق کی طرف مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو بلائیں۔ یہ اپیل کام یاب نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی قابلِ ذکر جماعتوں کے نزدیک مسلمانوں کے مسائل نیز آزادیِ وطن اور قیامِ پاکستان کے مقاصد کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ وہ جماعتیں اس کے لیے آمادہ نہ ہوسکیں کہ حالاتِ حاضرہ کے پیدا کردہ وقتی مسائل سے قطع نظر کرکے اصل اِسلامی نصب العین کے لیے براہِ راست کام کریں۔ اِسی طرح یہ جماعتیں اِس بات کے لیے بھی آمادہ نہ ہوسکیں کہ 'الہدیٰ' اور 'دینِ حق' کی طرف مسلمانوں اور انسانوں کو دعوت دیں، بجائے اِس کے کہ آزادیِ وطن یا قیامِ پاکستان کو اصل دعوت قرار دیں۔

مسلمانوں کی جماعتوں نے جو رویّہ اختیار کیا، اُس کی بِنا پر مولانا مودودیؒ کو یہ قدم اٹھانا پڑا کہ وہ ایک ایسی نئی جماعت کے قیام کی دعوت دیں جو براہِ راست اِسلامی نصب العین کے لیے کام کرے۔ اِس نئی جماعت کی تاسیس کے باوجود امت کے حالات اور مسائل سے جماعت نے ہمیشہ سرگرم دلچسپی لی اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی ہر مرحلے میں جاری رکھی کہ مسلمانوں کی اہم جماعتیں اور ادارے اصل اِسلامی نصب العین کو اختیار کرلیں اور اپنی تمام دلچسپیوں کو اِس بنیادی نصب العین کے تابع رکھیں۔ امت کے حالات سے سرگرم تعرّض کا کام مولانا مودودیؒ

نے جماعت کے قیام سے قبل ہی شروع کر دیا تھا۔اِس کی پہلی مثال'الجہاد فی الاسلام' کی تصنیف ہے۔اِسلام کے تصور جہاد پر عیسائی، آریہ سماجی اور دوسرے حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جارہے تھے، مسلمانوں کی طرف سے اُن کا کوئی معقول و مدلّل جواب نہیں دیا جارہا تھا۔اسی خاموشی کی بنا پر مسلمانوں میں معذرت خواہانہ ذہنیت، بد دِلی اور Demoralization کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔مولانا کی کتاب'الجہاد فی الاسلام' نے جو ۱۹۲۷ میں شائع ہوئی، اِس فضا کو ختم کیا اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کا اعتماد اِسلام پر بحال کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

دوسرا فکری چیلنج جو سامنے تھا وہ اُن موضوعات سے متعلق تھا، جن میں اِسلام اور فکرِ مغربی کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ متضاد ہے، مثلاً سود، پردہ، ضبطِ ولادت، سیکولرزم اور نیشنلزم۔مولانا نے اِن سب موضوعات پر لکھا اور فکرِ مغربی پر اتنی معقول و مدلّل تنقید کی کہ اِس فکر کا طلسم ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد کا اِسلام پر یقین بحال ہوا۔مولانا کے اِس کارنامے کا اعتراف اُن دینی حلقوں نے بھی کیا جو جماعت سے کسی نوعیت کا اختلاف رکھتے رہے ہیں۔بعد میں مولانا کی یہ تحریریں ہندستان سے آگے بڑھ کر عالمِ اسلام کے ہر گوشے میں پہنچیں۔انگریزی، عربی اور دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے اور ہندستان کی طرح دوسرے ممالک کے مسلمانوں پر مغربی فکر کے اثرات کا ازالہ کرنے میں اِن تحریروں سے غیر معمولی مدد ملی۔

مسلمانوں کے سامنے ایک اور چیلنج داخلی تھا۔ایک طرف مغربی تہذیب اور فکر نے مسلمانوں کے ذہنوں کو منتشر کر رکھا تھا اور اُن کے ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا، دوسری طرف خود مسلمانوں کے معاشرے کے داخلی مسائل حل طلب تھے۔مولانا مودودیؒ نے مسلمانوں کے اہلِ علم و فکر کو توجہ دِلائی کہ مسلمانوں کے معاشرے میں جو اِصلاحات مطلوب ہیں، اُن کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنائیں۔مولانا کی کتاب 'حقوق الزوجین' اِس کوشش کی آئینہ دار ہے۔اِس کتاب میں جو اِصلاحات تجویز کی گئی ہیں، اَب تک ہمارا مسلمان سماج اُن کی طرف توجّہ نہیں کر سکا ہے۔اسی طرح مولانا نے مروجّہ نظامِ تربیت (تصوف) کے متبادل کو موضوعِ گفتگو بنایا۔مولاناؒ نے اِس موضوع پر صرف اشارے کیے، لیکن جماعت کے دوسرے وابستگان نے اِس پر مبسوط انداز میں لِکھا۔اِس سلسلے میں مولانا امین احسن اِصلاحی کی تصنیف

'اِسلامی تزکیہ نفس' مولانا صدرالدین اِصلاحی کی 'اساسِ دین کی تعمیر' اور ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کی 'مقصدِ زندگی کا اسلامی تصور' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اُمت کے عام اہلِ علم نے جماعت کے اہلِ قلم حضرات کی اِن کاوشوں کا عام طور پر کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جماعت فکرِ مغربی کو شکست دینے میں تو کام یاب ہوئی، لیکن وہ داخلی محاذ پر اِس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکی کہ مسلمانوں کے رائج عائلی نظام اور نظامِ تربیت میں ضروری اِصلاحات کر سکے۔

آزادی سے قبل امت مسلمہ کی جو سب سے بڑی خدمت مولانا مودودیؒ نے انجام دی وہ یہ تھی کہ اپنی کتابوں 'مسئلہ قومیت' اور 'سیاسی کش مکش' کے ذریعے مسلمانوں کو کانگریس کی تحریک میں ضم ہونے سے بچایا اور اُن کے اجتماعی ذہن کو اِس کے لیے آمادہ کردیا کہ وہ اپنی مستقل ملّی حیثیت پر اِصرار کریں اور اپنی تحریکات کو اِسی انداز میں چلائیں۔

امت کے مسائل اور حالات سے ایجابی تعلق اور اِصلاحِ حال کی تدابیر اختیار کرنے کا یہ رویّہ، جو جماعت نے تقسیم ہند سے قبل اختیار کیا تھا، وہ تقسیم کے بعد بھی جاری رہا۔ جماعت اسلامی ہند نے اس سلسلے میں متعدد کام کیے۔ مثلاً فساد زدہ مسلمانوں کے حوصلے کی بحالی اور اُن کی رہ نمائی، دینی تعلیم کا نظم، دینی تعلیمی کونسل کا قیام، فساد زدگان میں ریلیف ورک، پرسنل لا کے تحفظ کے لیے بورڈ کے قیام میں سرگرم شرکت اور مسلمانوں کی تنظیموں کے مشترک پلیٹ فارمس کا قیام۔ اِسی طرح جماعتِ اسلامی پاکستان نے 'نظامِ اسلامی' کے قیام کا مطالبہ کیا، علماء کی مدد سے مشترک نکات منظور کرائے اور پھر اِسلامی دستور منظور کرانے کے لیے کوشش کی، پاکستان میں ابھرنے والی علاقائی تحریکوں کا مقابلہ کیا، قادیانیت کی روک تھام کے لیے عوام وخواص اور حکومت کو توجہ دِلائی اور موثر اقدامات کیے، اِسی طرح فتنۂ انکارِ حدیث کا بھی مقابلہ کیا۔

مندرجہ بالا روایت کو باقی رکھتے ہوئے جماعت کے وابستگان کو اِس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ امت کے مسائل، مسلمانوں کے حالات اور ان کے اداروں سے جماعت کا گہرا تعلق قائم ہو اور قائم رہے۔ جماعت کا رول یہ ہونا چاہیے کہ وہ مسلمان سماج کے اندر پیدا ہونے والے تمام رجحانات سے باخبر رہے، منفی رجحانات کا بروقت تدارک کرے، اچھے رجحانات کو پروان چڑھائے اور اِس سلسلے میں امت کے تمام صالح عناصر کا تعاون حاصل کرے۔

فرقہ بندی سے اجتناب

جماعت اسلامی کے تاسیسی اجتماع کے موقعے پر ہی مولانا مودودیؒ نے شرکاءِ اجتماع کو باخبر کردیا تھا کہ اس جماعت کو فرقہ نہیں بننا ہے۔

''فرقے کیسے بنتے ہیں؟'' اِس سوال پر بھی مولانا مودودیؒ نے روشنی ڈالی۔ مولانا نے بتایا کہ فرقہ بننے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ امت کا کوئی گروہ اپنی دعوت میں کسی ایسے جز کا اضافہ کردیتا ہے جو اصل اسلامی دعوت میں موجود نہیں ہوتا، یا اِسلامی دعوت کے کسی جز کو حذف کردیتا ہے۔ کچھ گروہ ایسا کرتے ہیں کہ وہ اجزاءِ دعوت میں تو کوئی کمی بیشی نہیں کرتے، لیکن دین میں اُن کی اہمیت کو گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ مولانا نے تنبیہ کی کہ جماعت اِس سلسلے میں محتاط رہے۔ وہ دعوتِ اسلامی کے مختلف پہلوؤں میں اہمیت کی جو ترتیب پائی جاتی ہے، اُس کو علیٰ حالہ برقرار رکھے۔ اگر یہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو فرقہ بن جانے کا خطرہ ختم ہوجاتا ہے۔

مولانا نے فرقہ بننے کی ایک دوسری وجہ بھی بتائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کے بعد کسی شخصیت کو یہ مقام دے دیا جائے کہ اُس پر کسی حیثیت سے ایمان لانا ضروری ہو۔ ماضی میں یہ غلطی بعض گروہوں نے کی ہے کہ اپنے رہ نماؤں کو 'مہدی' قرار دے کر اسی حیثیت میں اُن کی شخصیت کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی۔ اگر اِس نوع کی کوئی غلطی کی جائے تو وہ گروہ فرقہ بن جاتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی ہدایت کے مطابق جماعت نے اِس غلطی سے بچنے کا پورا اہتمام کیا ہے۔ دستور میں وضاحت کی گئی ہے کہ جماعت کی دعوت اپنے امیر کی شخصیت کی طرف نہ ہوگی، بلکہ جماعت کے نصب العین کی طرف ہوگی۔ اسی طرح امیرِ جماعت یا کسی اور شخصیت کو یہ مقام نہیں دیا جائے گا کہ اُس پر کسی حیثیت یا کسی پہلو سے ایمان لایا جائے۔ وابستگانِ جماعت سے جماعت کا مطالبہ جو کچھ ہوگا وہ صرف امیر کی اطاعت فی المعروف کا ہوگا۔

امت مسلمہ کے اہل علم میں تین موضوعات پر شروع ہی سے اختلافات رہے ہیں:

(الف) اسلامی قانون کی تفصیلات۔ اِس موضوع کو اِصطلاحاً 'فقہ' کہا جاتا ہے۔

(ب) نظامِ تزکیہ وتربیت کی تفصیلات۔ اِس موضوع کو ہماری روایت میں تصوف کہا جاتا ہے۔

(ج) اِسلامی عقائد وتصورات کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے طریقِ استدلال کی تفصیلات۔
یہ موضوع 'کلام' کہلاتا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے تاسیسی اجتماع میں یہ بات واضح کی کہ جماعت بہ حیثیت جماعت فقہی اور کلامی مسائل میں ایسا کوئی موقف اختیار نہیں کرے گی جس کی پابندی تمام ارکانِ جماعت کے لیے لازم ہو۔ بہ الفاظِ دیگر اِن موضوعات کے سلسلے میں ارکانِ جماعت کو اجازت ہوگی کہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں خود غور وفکر کریں، یا امت کے اندر موجود معروف مکاتبِ فکر میں سے کسی مکتبِ فکر سے وابستگی اختیار کریں۔ مولانا مودودیؒ خود فقہی اور کلامی مسائل پر لکھتے رہے اور آپ نے یہ کہا کہ گفتگو کی یہ آزادی سب ارکان کو حاصل ہے اور رہنی چاہیے۔ ارکانِ جماعت اِن موضوعات کے سلسلے میں مولانا مودودیؒ کے موقف یا نقطۂ نظر کے پابند نہیں ہیں۔

جماعت نے مسلمانوں سے صاف طور پر یہ بات کہی کہ اقامتِ دین کے مقصد کے لیے سارے مسلمان متفق ہوکر کوشش کریں اور جن اختلافات کی دین میں گنجایش موجود ہے، اُن کو گوارا کریں۔ یہی صحیح دینی مزاج ہے اور جماعت کا یہ مزاج برقرار رہنا چاہیے۔

شورائیت اور احتساب

دورِ اوّل کے بعد مسلمان سماج میں جن پہلوؤں سے زوال آیا، اِن میں نمایاں ترین 'شورائیت' اور 'احتساب' کے پہلو ہیں، جو دورِ اوّل کے معاشرے کے امتیازی اوصاف ہوا کرتے تھے۔

مسلمان معاشرے کے لیے 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' قرآن مجید کی واضح اور دائمی ہدایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ہمیں روایات سے معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کثرت سے مشورے کا اہتمام کرتے تھے۔ آپؐ کا یہ اُسوہ ہر دور میں امت کے لیے اور امت کے ہر گروہ کے لیے واجب الاتباع ہے۔ خلافتِ راشدہ میں ہمیں اِسی اُسوۂ نبوی کے مطابق شورائیت کا اہتمام نظر آتا ہے۔ حکومت وریاست کے معاملات کے علاوہ شورائیت کا اصول زندگی کے دوسرے میدانوں سے بھی متعلق ہے۔ مثلاً خاندانی نظام کے اندر بھی شورائیت

کے تقاضے پورے کیے جانے چاہئیں۔ دورِ اوّل کے معاشرے میں ہمیں زندگی کے تمام پہلوؤں میں شورائیت کی اسپرٹ کارفرما نظر آتی ہے۔

دورِ اوّل کے بعد جب مسلمانوں میں ملوکیت کا دور آیا تو حکم راں مطلق العنان ہو گئے اور شورائیت کا اصول فراموش کر دیا گیا۔ مولانا مودودیؒ نے اِس تبدیلی پر 'خلافت وملوکیت' میں وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اِس تبدیلی کا اثر پورے معاشرے پر پڑا اور اِصلاحی وتربیتی اِدارے بھی اِس فضا سے متاثر ہوئے۔ جو اِصلاحی کام حکومت کے اثرات سے آزاد تھے، اُن میں بھی اجتماعی کوششوں اور شورائی نظم کی بجائے ہمیں عموماً انفرادی کوششیں نظر آتی ہیں۔ سرگرم افراد کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ عموماً یہ تعمیری کوششیں بھی ختم ہو جایا کرتی تھیں۔ اس تاریخی پس منظر کی موجودگی میں جماعت اسلامی نے شورائیت کے اصول کو عملاً زندہ کیا۔ اُس نے اپنے نظم اور تحریک کے ڈھانچے کو شورائی بنیادوں پر مرتب کیا اور عملاً پالیسی سازی اور منصوبوں پر عمل درآمد میں شورائیت کے اصولوں کو برت کر دکھایا۔ جماعت کے اِس رویّے کا مثبت اثر امت کے عام اداروں اور تنظیموں پر بھی پڑنا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

تنقید واحتساب ایک باشعور مسلمان معاشرے کی پہچان ہے۔ دورِ اوّل میں افراد کے اندر نہی عن المنکر کی اسپرٹ زندہ تھی اور حکم راں اس جذبے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ملوکیت کے دور میں تنقید اور احتساب کی فضا مضمحل ہو گئی۔ حکم رانوں نے بسا اوقات اُن افراد پر سخت مظالم ڈھائے جنھوں نے اُن کو غلط باتوں پر ٹوکنے کی جرأت کی تھی۔ زوال کی اِس فضا نے خانقاہوں کو بھی متاثر کیا، چنانچہ مرشد اور شیخ کی شخصیت کو عملاً تنقید سے بالاتر قرار دیا گیا۔ مرید اور عقیدت مند عموماً اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے مرشد کے افعال واقوال پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔

جماعت نے تنقید واحتساب کے اِسلامی اصول کو بھی زندہ کیا اور صحت مند روایات کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ جماعت کے اندر تنقید واحتساب کے عمل کو فی الواقع زندہ رکھنے اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے تین امور کی ضرورت ہے:

(الف) جماعت میں ایسی فضا بنائی جائے جس میں تنقید واحتساب کی آزادی ہو اور اُس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہو۔

(ب) تنقید واحتساب کے آداب سے لوگ واقف ہوں اور اُن کا لحاظ کریں۔

(ج) تنقید واحتساب کے لیے ہرسطح پر باقاعدہ مواقع فراہم کیے جائیں اورتمام ارکان کومتعین وقفوں کے بعد یہ ملتے رہیں۔

عالمِ انسانیت سے تعلق

جماعت نے اپنی تاسیس کے وقت سے ہی مسلمانوں کے علاوہ عام اِنسانوں کوبھی مخاطب بنایا۔ یوں تو دعوت الی اللہ مسلمانوں کی ذمّے داری ہے اور تاریخ کے ہر دور میں مسلمان کچھ نہ کچھ اس کی طرف توجہ کرتے رہے ہیں۔(اِس طرح کی کوششوں کے تسلسل کا ایمان افروز تذکرہ مولانا مودودیؒ نے 'اسلام کا سرچشمۂ قوّت' میں کیا ہے۔)لیکن عموماً مسلمانوں کی جماعتوں نے اِس فریضے کی جانب توجّہ نہیں دی تھی۔ جماعت اسلامی نے دعوت الی اللہ کی اِس روایت کو زندہ کیا۔ جماعت کے بنیادی لٹریچر میں کئی کتابیں ایسی ہیں،جن میں مسلمانوں کے علاوہ عام انسانیت کو خطاب کیا گیا مثلاً سلامتی کا راستہ، بناؤ بگاڑ، زندگی بعد موت توحید و رسالت کا عقلی ثبوت،اسلام اور جاہلیت وغیرہ۔ جماعت اسلامی ہند نے اس فہرست میں نئی دعوتی کتب کا اضافہ کیا۔اب جماعت کی یاددہانی کے نتیجے میں ہندستان کے دوسرے دینی حلقے بھی فریضۂ دعوت کی جانب متوجہ ہونے لگے ہیں۔

جماعت کے آفاقی مزاج کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ ارضی وسماوی آفات کے مواقع پر جماعت نے جو خِدمات انجام دیں،اُن میں صرف مسلمانوں کی نہیں، بلکہ تمام مستحقین کی مدد کی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی، بلکہ اِسلام کے مزاج کا عین تقاضا تھا۔لیکن موجودہ حالات میں یہ مزاج ایک اجنبی مزاج بن چکا ہے۔اِس لیے اِسلامی مزاج کی تجدید کی بڑی معنویت ہے۔

جماعت کی قیادت کے ۔لیے مناسب ہے کہ جماعت کی امتیازی خصوصیات اپنے وابستگان کو یاد دِلائے اور اِن خصوصیات کو زندہ رکھنے کا عملاً اہتمام بھی کرے۔اس طرح وہ امت کے مجموعی مزاج میں مثبت اور صحت مند تبدیلیاں لاسکے گی اور عالمِ انسانیت پر بھی اچھے اثرات ڈالے گی۔

اسلامی تحریک کا طریقِ کار

دنیا کے ہر گوشے میں ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو اسلامی خطوط پر معاشرے کی تعمیرِ نو اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوشش کر رہی ہیں۔ ایسی کوششوں کو 'تحریکِ اسلامی' کہا جاتا ہے۔ مسلمان دنیا تحریکِ اسلامی سے بڑی حد تک واقف ہے اور اب غیر مسلم دنیا اور عالمی ذرائعِ ابلاغ بھی اس سے واقف ہو رہے ہیں، اگرچہ وہ اس کے بارے میں متعدد غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے بارے میں متعدد سوالات مختلف حلقوں کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں، جن کا تعلق اس کے مقصد اور طریقِ کار سے ہے۔ سطورِ ذیل میں چند سوالات کا جائزہ پیشِ نظر ہے۔

حاکمیتِ الٰہ کا تصور

تحریکِ اسلامی کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس نے اپنے اساسی پیغام میں حاکمیتِ الٰہ کو نمایاں اور مرکزی مقام کیوں دیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل مناسب ہوگا کہ 'حاکمیتِ الٰہ' کی اصطلاح کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ اس اصطلاح کا مفہوم دستورِ جماعت اسلامی ہند میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''......بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ یعنی الٰہ صرف اللہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس عقیدے کے پہلے جز یعنی اللہ تعالیٰ کے واحد الٰہ ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی اللہ ہم سب انسانوں کا معبودِ برحق اور حاکمِ تشریعی ہے، جو ہمارا اور اس پوری کائنات کا

خالق، پروردگار، مدبر، مالک اور حاکمِ تکوینی ہے۔ پرستش کا مستحق اور حقیقی مطاع صرف وہی ہے اور ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ نہ سمجھے، کسی کو بہ اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور ان تمام اطاعتوں کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کے تحت نہ ہوں، کیوں کہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو فی الواقع مالکیت اور حاکمیت کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت مانے اور صرف اسی ضابطے کو ضابطہ تسلیم کرے، جو اللہ کا مقرر کردہ ہو، یا اس کے احکام و ہدایات کے تحت ہو، اور جو اس کے خلاف ہو، اسے رَد کردے۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی کو اصل حجت، سند اور مرجع قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے اور جو اُن کے خلاف ہو اسے ترک کردے۔'' (دستور جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۳)

مندرجہ بالا تصور حاکمیتِ الٰہ قرآن مجید سے اخذ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیات پر غور کیا جا سکتا ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (البقرۃ:۱۰۷)

''کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی، اللہ ہی کے لیے ہے۔''

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (الانعام:۵۷)

''فیصلے کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے۔''

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (الشوریٰ:۱۰)

''تمہارے درمیان جو اختلاف بھی ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔''

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ (یوسف:۴۰)

''حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (الاعراف:۳)

''پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے، تمہارے رب کی طرف سے۔ اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔''

قرآن مجید کی ان صریح تعلیمات کی روشنی میں معقول موقف وہی ہے جو تحریکِ اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ کہ حاکمیتِ الٰہ کو دینی نظامِ تصورات میں مرکزی اور نمایاں مقام حاصل ہونا چاہئے۔

اسلامی حکومت

اسلامی تحریک کے سلسلے میں بعض افراد کا تردّد یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کا قیام چاہتی ہے۔ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کو مقصود اور ضروری قرار دینے کی کیا دلیل ہے؟ اس سلسلے میں ذیل کی آیات پر غور کرنا چاہیے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدۃ:۴۸)

''ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تصدیق کرتی ہے پہلی آئی ہوئی کتابوں کی اور نگہبان ہے اُن پر۔ پس جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے تم اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی میں اس حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے پاس آیا ہے۔''

ظاہر ہے کہ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے اقتدار درکار ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (النساء:۵۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے کچھ اولی الامر ہونے چاہئیں جن کی ان کو اطاعت کرنی چاہیے۔ بہ الفاظِ دیگر، مسلمانوں کو اجتماعی نظم کے تحت زندگی گزارنی چاہیے۔ یہی نظامِ سمع و طاعت اپنی وسیع شکل میں اسلامی حکومت کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحدید:۲۵)

''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ دیکھے کہ کون اس کو دیکھے بغیر، اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں لوہے سے مراد، سیاسی اور جنگی طاقت ہے اور کلام کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو قیامِ عدل کی محض ایک اسکیم پیش کر دینے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اس (قیامِ عدل کی اسکیم) کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے، اسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جا سکے اور اس کی مزاحمت کرنے والوں کا زور توڑا جا سکے۔'' (ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو آسمانی کتاب سے راہِ راست پر نہ آئیں اور انصاف کی ترازو کو دنیا میں سیدھا نہ رکھیں، ضرورت پڑے گی کہ ان کی گوشمالی کی جائے اور ظالم و کج رو معاندین پر اللہ و رسول کے احکام کا وقار و اقتدار قائم رکھا جائے۔''

علانیہ جدو جہد

بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ تحریک اسلامی علانیہ جدو جہد کیوں کرتی ہے اور خفیہ طریقے استعمال کر کے سرعت کے ساتھ انقلاب کیوں نہیں لے آتی؟ اس سوال کا مدلل جواب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ان الفاظ میں دیا ہے:

''خفیہ تنظیموں میں چند افراد مختارِ کُل بن جاتے ہیں اور پھر ساری تنظیم یا تحریک اُن ہی کی مرضی پر چلتی ہے۔ اُن سے اختلاف کرنے والوں کو فوراً ختم کر دیا جاتا ہے، ان کی پالیسی سے اظہارِ بے اطمینانی سخت ناگوار اور ناپسندیدہ قرار دی جاتی ہے۔ اَب آپ خود سوچیں کہ یہی چند افراد جب برسرِ اقتدار آئیں گے تو کس قدر بدترین ڈکٹیٹر ثابت ہوں گے......

میرا مشورہ یہی ہے کہ خواہ آپ کو بھوکا رہنا پڑے، گولیاں کھانی پڑیں، مگر صبر کے ساتھ، تحمل کے ساتھ، کھلم کھلا علانیہ طور پر اپنی اصلاحی تحریک کو قانون، ضابطے اور

اخلاقی حدود کے اندر چلاتے رہیے۔خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار بھی علانیہ اور کھلم کھلا تبلیغ کا طریقہ تھا۔“ (تصریحات)

مولانا اس ضمن میں مزید کہتے ہیں:

”جب تک ہمت اور جرأت اور عزم و استقلال کے ساتھ برسرِ زمین (Openly) کام نہیں کیا جائے گا، اسلامی ریاست قائم نہیں ہوسکتی۔زیرِ زمین (Under Ground) کام کے نتیجے میں اسلامی ریاست نہیں بن سکتی......

درحقیقت جب تک برسرِ زمین کام کر کے عام لوگوں کے خیالات کو تبدیل نہیں کیا جائے گا، اُن کو پوری طرح ہم خیال نہیں بنایا جائے گا اور معاشرے کو اسلامی نظام کے لیے تیار نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک اسلامی ریاست کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔“ (ایضاً)

لاقانونیت سے اجتناب

سطورِ بالا میں عرض کیا گیا تھا کہ بعض دوستوں کو علانیہ جدوجہد پر اعتراض ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی تیز رفتار خفیہ طریقہ اختیار کر کے جلد انقلاب لے آیا جائے اور علانیہ طریقوں پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس کے بالکل برعکس بعض حلقوں کو یہ بدگمانی ہے کہ اسلامی تحریک تخریبی طریقے اختیار کرتی ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بدگمانی بالکل بے بنیاد ہے۔اسلامی تحریک کا اصولی موقف یہ ہے کہ فساد فی الارض سے بچا جائے۔طریق کار کے ذیل میں جماعت اسلامی ہند کے دستور میں کہا گیا ہے:

”جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی اور کبھی ایسے ذرائع یا طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں، یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کشمکش اور فساد فی الارض رونما ہو......

وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔" (دستورِ جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۵)

لاقانونیت سے اجتناب کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا صدرالدین اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"موجودہ نظامِ (باطل) کو اصولی اور اعتقادی طور پر غلط، فاسد اور قابلِ ردقرار دینے کے باوجود، جہاں تک عام قوانینِ ملکی کا تعلق ہے، تحریکِ اسلامی اس بات کو صحیح نہیں سمجھتی کہ عملاً بھی اُن کو رد کر دیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں اُس کی ہدایت یہ ہے کہ ان قوانین کو اصلاً غلط اور باطل سمجھنے کے باوجود، عملی پابندی ان کی ضرور کی جائے، اِلّا یہ کہ بالفرض کوئی قانون ہی ایسا ہو جس کی پیروی سے شریعت کی کھلی ہوئی خلاف ورزی اور اللہ و رسول کی راست نافرمانی لازم آتی ہو۔ عام ملکی قوانین کی عملی پابندی کا یہ مسلک، اُس نے کسی مصلحت یا سیاسی ضرورت کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ خود اسوہ انبیاء ہی کی روشنی میں اختیار کیا ہے۔

اس اسوے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غلط نظام بھی جب تک قائم اور نافذ ہو، اس وقت تک اس کے عام قوانین کی عملی پابندی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اصول اس واقعیت پسندی پر مبنی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی بہ ہر حال کوئی نہ کوئی ضابطہ اور قانون چاہتی ہے۔ اس کے بغیر وہ قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ اب اگر وقت کے کارفرما قوانین کی پابندی ترک کر دی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی یا تو جامد ہو کر رہ جائے گی، یا پھر اس میں نظم و ضبط باقی نہ رہ جائے گا۔

پہلی صورت عملاً ناممکن ہے اور دوسری سرتاسر انتشار، انارکی (Anarchy) اور فتنہ و فساد کے ہم معنی ہے، اس لیے وہ بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی......غلط سے غلط اور بد سے بدتر قوانین وضوابط کی حکم رانی بھی انسانی زندگی کے عمومی مصالح کے لیے انارکی اور

لاقانونیت سے بہ ہر حال کم تر درجے کی مصیبت ہے۔اس لیے شریعتِ اسلامی کا نقطۂ نظر اس باب میں بجا طور پر یہ ہے کہ ایک زیادہ سخت اور تباہ کن مصیبت سے بچنے کے لیے کسی باطل، نظامِ غالب کے قوانین کی پابندی کی نسبتاً چھوٹی مصیبت کو لازماً گوارا کیا جائے۔'' (تحریکِ اسلامی ہند، باب ۸)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ لاقانونیت سے اجتناب اسلامی تحریک کا ایک لازمی وصف ہے۔اس بنا پر تخریبی طریقے اختیار کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

قیامِ خلافت

بعض دوستوں کا اعتراض یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی نے 'اسلامی حکومت' کے قیام کو اپنی منزل کے طور پر پیش کیا ہے، جبکہ اسے 'احیائے خلافت' کو اپنا مقصود قرار دینا چاہیے تھا۔ اس اعتراض کے سلسلے میں تین حقیقتیں پیش نظر رہنی چاہئیں:

(الف) پہلی حقیقت یہ ہے کہ اصولی طور پر اقامتِ دین کا کام کسی جغرافیائی خطے میں محدود نہیں ہے۔اقامتِ دین کی اصطلاح میں لفظ 'دین' کا مفہوم دستور جماعت اسلامی ہند میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''لفظ دین سے مراد وہ دین حق ہے، جسے اللہ رب العالمین، اپنے تمام انبیاء کے ذریعے مختلف زمانوں اور ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نازل فرمایا اور جو اَب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام 'اسلام' ہے۔'' (دستورِ جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۴)

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دین عالم گیر ہے، چنانچہ اس کے قیام کا فریضہ بھی تمام دنیا کے مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔البتہ دنیا اس وقت مختلف حکومتوں کے زیرِ انتظام علاقوں میں تقسیم ہے، اس لیے ان مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے لیے فی الحال یہ ممکن نہیں ہے کہ

کارِ اقامتِ دین کے لیے وہ ایک مشترک تنظیمی ہیئت بناسکیں۔ لامحالہ اس صورت حال میں یہ ضروری ہوگا کہ ہر ملک میں وہاں کے حالات کے پیشِ نظر مناسب تنظیمی ہیئت اقامتِ دین کے مقصد کے لیے بنائی جائے۔اس سے دین یا کارِ اقامتِ دین کی عالم گیری کی نفی نہیں ہوتی۔

(ب) دوسری حقیقت، جو پیشِ نظر رہنی چاہیے، یہ ہے کہ اقامتِ دین کا مثالی نمونہ خلافت راشدہ کا نمونہ ہے۔ چنانچہ اقامتِ دین کی عملی سرگرمیوں کے کسی ایک خطے یا ملک میں محدود ہونے کے باوجود اس مثالی نمونے (Ideal) کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جائے گا۔ دستورِ جماعت اسلامی ہند میں کہا گیا ہے:

> ''اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین عملی نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد ﷺ اور حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔'' (ایضاً)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''خلافتِ راشدہ کا دور......ایک روشنی کا مینار تھا، جس کی طرف بعد کے ادوار میں فقہاء ومحدثین اور عام دین دار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملے میں معیار سمجھتے رہے۔'' (خلافت وملوکیت)

(ج) تیسری حقیقت جو سامنے رہنی چاہیے، یہ ہے کہ کسی ایک ملک میں اسلامی حکومت کا قیام ایک مرحلہ ہے، جو عالمی خلافت کے احیاء کی جانب سفر کے دوران پیش آئے گا۔ چنانچہ کسی ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کو آخری منزل سمجھنا درست نہ ہوگا۔ ملکی سطح کی اسلامی حکومتوں کے قیام کے بعد وہ مرحلہ آئے گا جہاں عالمی خلافت کا انعقاد ممکن ہو سکے گا۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''(اسلامی ریاست) ایک ایسی ریاست ہے جو رنگ، نسل، زبان یا جغرافیہ کی عصبیتوں کے بجائے صرف اصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ زمین کے ہر گوشے میں نسلِ انسانی کے جو افراد بھی چاہیں، ان اصولوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کسی امتیاز و تعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس نظام میں شامل ہو سکتے ہیں۔ دنیا

جمہوریت

بعض احباب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلامی تحریک نے جمہوریت کی تائید شروع کر دی ہے، جب کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ۱۹۶۸ء میں ایک سوال پوچھا گیا تھا۔ سوال یہ تھا:

''اسلامی مفکرین نے موجودہ صدی میں متعدد مغربی اصطلاحیں استعمال کی ہیں مثلاً ڈیموکریسی، نیشنلزم، وطنیت، پارلیمنٹ، دستور، سوشلزم وغیرہ۔ بعض اسلامی مفکرین ان اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنے تجربات کی روشنی میں بتا سکتے ہیں کہ آئندہ ایسے اسلامی مفکرین پیدا ہوں گے جو ہر اس چیز کو کلیتاً رد کر دیں گے جو قرآن وسنت سے خارج ہوگی۔'' (تصریحات)

مولانا مودودیؒ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

''موجودہ زمانے کے لوگوں کو (اپنی) بات سمجھانے کے لیے جدید اصطلاحات کا استعمال تو ناگزیر ہے، لیکن ان کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اصطلاحوں سے پرہیز اولیٰ ہے، بلکہ اجتناب واجب ہے، مثلاً اشتراکیت۔ بعض کا استعمال اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اُن کے اسلامی مفہوم اور مغربی مفہوم کا فرق پوری طرح واضح کر دیا جائے، مثلاً جمہوریت یا دستوریت یا پارلیمنٹری سسٹم۔ بعض (اصطلاحات) کو سرے سے کوئی اسلامی مفہوم دیا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً نیشنلزم۔ (ایضاً)

ایک سال بعد ۱۹۶۹ء میں مولانا مودودیؒ سے اسی موضوع سے متعلق ایک اور مجلس میں سوال پوچھا گیا، جو یہ تھا:

''مولانا! جب اسلامی جمہوریت کی اصطلاح بولی جاتی ہے تو اسے درست قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس طرح اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھی درست نہیں ہو سکتی؟''

(۵-اے ذیلدار پارک)

مولانا نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:

''جمہوریت سے مراد وہ سیاسی نظام ہے جس میں حکومت عوام کی مرضی سے بنے، عوام کی مرضی سے قائم رہے اور عوام کی مرضی سے تبدیل ہو سکے۔ اب جمہوریت کا ایک مغربی تصور ہے اور دوسرا اسلامی تصور ہے۔

مغربی تصور یہ ہے کہ اس میں اقتدارِاعلیٰ کے مالک عوام ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی قانون سازی میں آخری فیصلہ کُن حیثیت عوام کی مرضی کو حاصل ہوتی ہے۔ عوام کی اکثریت حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر سکتی ہے۔

اس کے برعکس اسلامی جمہوریت یہ ہے کہ حکومت تو اس میں بھی عوام کی مرضی سے بنتی ہے، عوام ہی کی مرضی سے قائم رہتی ہے اور انہی کی مرضی سے تبدیل ہو سکتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ جمہوریت کے اسلامی تصور کے مطابق اقتدارِاعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور مسلمانوں کو قانون سازی کا اختیار صرف شریعتِ اسلامی کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہے۔ ان حدود سے باہر جا کر وہ کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ وہ سارے کے سارے مل کر بھی خدا کے کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کر سکتے۔ ان معنوں میں مغرب کی مطلق العنان اور بے قید جمہوریت کے مقابلے میں یہ ایک حدود آشنا جمہوریت ہے اور اسی مناسبت سے اس کے لیے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح استعمال کرنا درست ہے۔ گویا اگر Sovereignty (اقتدارِاعلیٰ) کے مغربی تصور کو اقتدارِاعلیٰ کے اسلامی تصور سے بدل دیا جائے تو تمام مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

اس کے برعکس اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اس لیے غلط ہے کہ سوشلزم محض کسی سیاسی نظام کا نام نہیں ہے، بلکہ سوشلزم ایک Ideology (نظریۂ زندگی) ہے اور اپنے ہمہ گیر سیاسی اور اجتماعی پروگرام کی وجہ سے ایک ایسے نظام کی حیثیت رکھتا ہے جس کا کوئی جز اس کے کل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک علیحدہ مذہب ہے۔ اس کا تصورِ انسان اور تصورِ کائنات اسلام کے تصورِ انسان و کائنات سے یکسر

مختلف اور متصادم ہے۔اس کی تعبیرِ تاریخ سراسر مادّی ہے اور اس میں روحانیت اور مذہب کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس لحاظ سے اس کے ساتھ لفظ اسلامی کا اضافہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اسلامی عیسائیت یا اسلامی بودھ ازم وغیرہ کہہ کر انھیں مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کرے۔'' (ایضاً)

خلافتِ راشدہ کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں روحِ جمہوریت پائی جاتی تھی۔فرماتے ہیں:

''اس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں تنقید اور اظہارِ رائے کی پوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دست رس میں تھے۔وہ خود اپنے اہلِ شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحث میں حصہ لیتے تھے۔ان کی کوئی سرکاری پارٹی نہ تھی، نہ اُن کے خلاف کسی پارٹی کا کوئی وجود تھا۔آزادانہ فضا میں ہر شریکِ مجلس اپنے ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔تمام معاملات اہلِ حل وعقد کے سامنے بے کم وکاست رکھ دیے جاتے اور کچھ چھپا کر نہ رکھا جاتا۔فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے تھے نہ کہ کسی کے رعب داب، یا کسی کے مفاد کی پاسداری یا کسی جتھہ بندی کی بنیاد پر۔

پھر یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطے ہی سے نہ کرتے تھے، بلکہ ہر روز پانچ مرتبہ نمازِ باجماعت میں، ہر ہفتے جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں اُن کو قوم سے اور قوم کو اُن سے سابقہ پیش آتا تھا۔ان کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب ودربان کے بغیر ان کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے تھے۔وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے، کسی ہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر، عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ان تمام مواقع پر ہر شخص کو انھیں ٹوکنے، ان پر تنقید کرنے اور ان سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی۔اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت ہی نہ دیتے تھے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔'' (خلافت وملوکیت)

ان تصریحات سے درجِ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

۱۔ اسلامی تحریک حاکمیتِ الٰہ کی علم بردار ہے اور دیگر تمام حاکمیتوں کو رد کرتی ہے، جن میں حاکمیتِ جمہور بھی شامل ہے۔

۲۔ اسلامی تحریک اس اصول کی تائید کرتی ہے کہ شریعتِ الٰہی کے نفاذ کے لیے جو حکومت تشکیل پائے اس میں عوام کو حکم رانوں پر تنقید اور ان کے احتساب کی پوری آزادی حاصل رہنی چاہیے۔

اس مزاج کی بنا پر اسلامی تحریک ایک طرف تو جمہور کی حاکمیت کے بجائے اللہ کی حاکمیت کی طرف انسانوں کو دعوت دیتی ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی ضروری سمجھتی ہے کہ عوام کا حقِ تنقید و احتساب جس حد تک کسی ملک کے نظام میں موجود ہو، وہ باقی رہے اور اس میں اضمحلال نہ آنے پائے۔ حاکمیتِ جمہور کی تردید اور طرزِ حکم رانی کی اچھی قدروں (جنھیں آج کل جمہوری قدریں کہا جاتا ہے) کی تائید میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اسلامی حکومت میں حکم راں کون ہوں گے تو اس کا اصولی جواب اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ کی ہدایت میں موجود ہے (یعنی مسلمان اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں) اس اصول کے عملی انطباق کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوروی خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسرِ اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے خود کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی اس کے لیے کوئی کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امت نے خلافتِ راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بہ خود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔'' (ایضاً)

خلافتِ راشدہ میں رائج اس طرزِ عمل کی روشنی میں اسلامی مزاج کیا تقاضا کرتا ہے؟

اس کو مولانا مودودیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحابِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا متفق علیہ تصور یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے، جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے۔'' (ایضاً)

درجِ بالا اسلامی مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ حکم رانوں کے انتخاب کے سلسلے میں مشورے اور عوام کی آزادانہ رضامندی پر مبنی معقول طریقے سے دنیا کو متعارف کرایا جائے۔ دنیا میں جو جمہوریت اس وقت رائج ہے، اس میں عوام کی آزادانہ رضامندی کے حصول کا تو کچھ اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن حکم رانوں کے انتخاب میں مشورے کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا۔ مزید برآں باہم متصادم پارٹیوں کی موجودگی، پارٹیوں کا اصولوں کے بجائے مفادات کا علم بردار ہونا، امیدواری کا طریقہ اور امیدواروں کے لیے کنویسنگ، موجودہ جمہوریت کے ایسے عناصر ہیں جو عوام کو صالح فضا میں باہم مشورے کا موقع نہیں دیتے۔ مشورے کے بجائے طاقت ور طبقات اور گروہ اپنے پسند کے افراد کو پروپیگنڈے اور وسائل کی طاقت کے ذریعے عوام پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں عوام کی جو رائے حاصل کی جاتی ہے، وہ ان کی آزادانہ رضامندی کا مظہر نہیں کہی جاسکتی۔

اس پس منظر میں اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(الف) بنیادی اصلاح، جو مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ حاکمیتِ جمہور کے بجائے حاکمیتِ الٰہ کو تسلیم کیا جائے۔

(ب) اخلاقی حدود کے اندر عوام کو تنقید و احتساب کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

(ج) پارٹی سسٹم اور امیدواری پر مبنی موجودہ جمہوری طریقوں کے بجائے ایسے طریقے سوچے جانے چاہئیں جہاں حکم رانوں کے انتخاب کے سلسلے میں عوام کو آزادانہ مشورے کا موقع مل سکے۔

(د) حکم راں بہ ہر صورت وہی لوگ ہونے چاہئیں جنھیں عوام کی آزادانہ رضامندی سے حکم راں بنایا گیا ہو۔

(ہ) بادشاہی اور آمریت کے مقابلے میں دنیا میں جو جمہوری نظام موجود ہیں اُن کی اصولی اور عملی خرابیوں سے عوام کو آگاہ کرنا چاہیے۔ ان خرابیوں کے باوجود عوام کی آزادانہ رضامندی کے اصول کو یہ جمہوری نظام تسلیم کرتے ہیں۔ یہ معقولیت، جو اِن نظاموں میں موجود ہے، تائید اور قدردانی کی مستحق ہے۔

(و) اگر کسی ملک میں یہ کوشش کی جارہی ہو کہ عوام کی آزادانہ رضامندی کے حصول پر مبنی جمہوری طرزِ انتخاب کو ختم کردیا جائے یا اسے کم زور اور بے اثر بنادیا جائے، تو ایسی ناروا کوشش کی مزاحمت کی جانی چاہیے۔

(ز) اگر تنقید و احتساب کی آزادی جیسی جمہوری قدروں اور فطری انسانی حقوق کو ختم کرنے یا مضمحل کرنے کی کوشش کی جارہی ہو تو ایسی منفی کوششوں کی بھی مزاحمت کی جانی چاہیے۔

اسلامی تحریک کا مندرجہ بالا نقطۂ نظر حقیقت پسندی اور اعتدال پر مبنی ہے۔ جتنی کچھ صالحیت اور معقولیت موجودہ دنیا کے طرزِ عمل میں موجود ہے، اس کی قدر کی جانی چاہیے اور اسے باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ افکار و تصورات، نظریات و اقدار اور عملی طریقوں میں جس تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت ہے، اس کی مسلسل نشان دہی کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔

بابِ نہم :

اقامتِ دین پر اعتراضات اور لائحہِ عمل

(1) اقامتِ دین کا تصور

(2) اہم اعتراضات اور شبہات

(3) علمی و فکری جوابات

(4) عملی لائحہِ عمل

(5) موجودہ دور میں اسلامی جدو جہد

تصورِ اقامتِ دین پر چند اعتراضات؟

سیّد سعادت اللہ حسینی ○

اقامت دین کے تصورات پر بعض مسلم دانش وروں کی جانب سے کی جانے والی تنقید دو طرح کی ہے: ایک تو وہ لوگ ہیں جو سرے سے اس بات کے قائل ہی نہیں ہیں کہ مملکت کے سیاسی اُمور اور اجتماعی معاملات میں اسلام بھی کوئی رہنمائی کرتا ہے یا اگر کرتا بھی ہے تو آج کے زمانے میں اس کی پیروی لازم نہیں ہے۔ عصر حاضر کے سیکولر افکار سے متاثر یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ: ''اسلام سمیت تمام مذاہب کا دائرہ، افراد کی ذاتی زندگیوں تک محدود ہے۔ اجتماعی معاملات میں مذہب کی دخل اندازی فتنہ وفساد کا سبب بنتی ہے اور یہ مذہب کا دائرہ کار بھی نہیں ہے۔ اسلام کے وہ احکام جن کا تعلق ریاست کے انتظام اور پالیسی سے یا قانون سازی سے ہے، وہ ایک مخصوص دور کی ضرورتوں کے لیے تھے۔ آج اُن تعلیمات سے روشنی تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن اُن کی ہوبہو پیروی نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے''۔ اس تحریر میں ہم اس اعتراض کو زیر بحث نہیں لائیں گے کہ یہ اعتراض علیحدہ سے تفصیلی تجزیہ چاہتا ہے۔ اس مکتب فکر کا ذکر ابتدا ہی میں اس لیے کردیا کہ آگے کے مباحث میں اس کا حوالہ آئے گا۔

ہمارے پیش نظر مسلمان اہل علم کا وہ طبقہ ہے، جو اسلام کی جامعیت اور اجتماعی زندگی سے متعلق اس کی تعلیمات کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ لوگ مانتے ہیں کہ اسلام نے ریاست کا تصور بھی دیا ہے، ریاست کے لیے قوانین بھی تجویز کیے ہیں، اور یہ احکام، اسلام اور اسلامی شریعت کا جز ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''ان احکام کا تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ہے۔ اس کے مخاطب

○ نائب امیر جماعت اسلامی ہند

حکمران ہیں۔ اگر کسی کو حکومت اور اختیار مل جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قانون سازی اور ریاست کے انتظام و انصرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرے، لیکن عام مسلمان، جنھیں حکومت یا اقتدار حاصل نہیں ہے، وہ نہ ان احکام کے مخاطب ہیں اور نہ وہ اس کے مکلف ہیں کہ اسلامی شریعت کے ان احکام کی تعلیم، ترویج اور تنفیذ کے لیے کوئی اجتماعی جدوجہد کریں۔ ان کا فریضہ بس ذاتی زندگیوں میں اور معاشرے (society) کے جن امور پر انھیں اختیار حاصل ہے، انھی میں اللہ کے احکام کی تعمیل تک محدود ہے'۔ یہاں پر اقامتِ دین کے حوالے سے مولانا وحیدالدین خان صاحب اور جناب جاوید احمد غامدی کے نقطۂ نظر کا خلاصہ پیش کر کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اقامتِ دین کا تصور

اس سے پہلے کہ ہم اس نقطۂ نظر کا جائزہ لیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اقامت دین کے بارے میں تحریک اسلامی اور مولانا مودودی کے خیالات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

جماعت اسلامی ہند کے دستور کی دفعہ ۴ میں جماعت کا نصب العین اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے، جس کا حقیقی محرک صرف رضاے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے''۔

اس نصب العین کی تشریح اس دفعہ میں اس طرح کی گئی ہے: ''اقامتِ دین میں لفظ 'دین' سے مراد وہ دینِ حق ہے، جسے اللہ ربُّ العالمین اپنے تمام انبیا علیہم السلام کے ذریعے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نازل فرمایا، اور جو اَب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام 'اسلام' ہے۔ یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اُس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے، جو اس دائرے سے خارج ہو۔ یہ دین جس طرح رضاے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی

صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔ اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے۔ اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا اِرتقا، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو'۔[۱]

دستورِ جماعت کی دفعہ ۵ اس نصب العین کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے طریق کار سے بحث کرتی ہے۔ اس کے درج ذیل جملے قابلِ توجہ ہیں:

> جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی اور کبھی ایسے ذرائع یا طریقے استعمال نہ کرے گی، جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رُونما ہو۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پُرامن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔[۲]

ان دفعات میں خاص طور پر درج ذیل باتیں قابلِ توجہ ہیں:

۱- 'اقامتِ دین' کا مطلب صرف ریاست کی سطح پر اسلامی احکام کا نفاذ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی میں اسلام کی پیروی ہے۔ اس میں ریاست بھی شامل ہے اور اس کے ساتھ افراد کا اللہ سے تعلق، ان کے جذبات و داعیات، ان کی عبادات، ان کے اخلاق اور معاشرے سے متعلق تمام اُمور و معاملات بھی شامل ہیں۔

۲- دین کا قیام یا زندگی کے تمام گوشوں میں اسے جاری و نافذ کرنے کا کام زور زبردستی کے ذریعے انجام نہیں پائے گا، بلکہ لوگوں کی ذہن سازی یا رائے عامہ کی تربیت کے ذریعے انجام پائے گا۔

یہ باتیں اجتماعی کمٹ منٹ اور گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ جماعت کے دستور سے بھی واضح ہیں اور ساتھ ہی مولانا مودودیؒ کے افکار میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ان باتوں کا اعادہ ملتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں درج ذیل قسم کی باتیں ہم کو کثرت سے ملتی ہیں:

● حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عمر بن عبدالعزیز [م: ۷۲۰ء] جیسا فرماں روا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملے میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیوں کہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ ہندستان میں سلطان محمد بن تغلق [م: ۱۳۵۱ء] اور اورنگ زیب عالم گیر [م: ۱۷۰۷ء] جیسا طاقت ور بادشاہ اپنی شخصی دین داری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہوسکتا ہے، جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات وتصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدوجہد سے بدل ڈالے۔[۳]

● میرا مشورہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ خواہ آپ کو بھوکا رہنا پڑے، گولیاں کھانی پڑیں، مگر صبر کے ساتھ، تحمل کے ساتھ، کھلم کھلا علانیہ طور پر اپنی اصلاحی تحریک کو قانون، ضابطے اور اخلاقی حدود کے اندر چلاتے رہیے۔[۴]

● کوئی دوسرا نظام، مثلاً کمیونزم لوگوں پر زبردستی ٹھونسا جا سکتا ہے......لیکن اسلام اس قسم کا نظام نہیں ہے۔ وہ پہلے لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر لوگ خلوص کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چل سکتے۔ پھر وہ اپنے اصولوں کا فہم اور ان کے برحق ہونے پر اطمینان بھی عوام کے اندر ضروری حد تک اور خواص (خصوصاً کارفرماؤں) میں کافی حد تک پیدا کرنا لازم سمجھتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر اس کے اصول واحکام کی صحیح تنفیذ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ عوام وخواص کی ذہنیت، اندازفکر اور سیرت وکردار میں بھی اپنے مزاج کے مطابق تبدیلی لانے کا تقاضا کرتا ہے، کیوں کہ یہ نہ ہو تو اس کے پاکیزہ اور بلند پایہ اصول واحکام اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکتے۔ یہ جتنی چیزیں میں نے بیان

کی ہیں، اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے سب کی سب ضروری ہیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی جبراً لوگوں کے دل و دماغ میں نہیں ٹھونسی جاسکتی۔[۵]

اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری نصیحت یہ ہے کہ انھیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحے کے ذریعے سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعے سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے۔ بڑے پیمانے پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے۔ اخلاق سے دلوں کو مسخر کیجیے اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پایدار اور مستحکم ہوگا، جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کرسکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رُونما بھی ہوجائے تو جس راستے سے وہ آئے گا، اُسی راستے سے وہ مٹایا بھی جاسکے گا۔[۶]

یہ اقتباسات ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں، تاکہ بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ واضح رہے کہ تحریک اسلامی اور مولانا مودودی کے نزدیک 'اقامت دین' کا مطلب اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ اقامت دین صرف حکومت کی تشکیل یا تبدیلی کا نام نہیں ہے۔ یہ افراد اور معاشرے کی ہمہ گیر اصلاح کا نام ہے۔ ریاست کی تشکیل کا ہدف بھی یقیناً اس میں شامل ہے، لیکن اقامت دین کا تصور صرف ریاست کی اصلاح تک محدود نہیں ہے اور نہ یہ اقامت دین کا اصل ہدف ہے۔ اقامت دین کا جو تصور ان عبارتوں سے واضح ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی جائے گی۔ لوگ اس کے قائل ہوں گے، اور ان کے ذہن، اخلاق اور رویے اس دین سے ہم آہنگ ہوں گے، تو اس کے نتیجے میں مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے راہ ہموار ہوگی اور راے عامہ کی تربیت کے نتیجے میں ریاست بھی اسلامی رنگ اختیار کرے گی۔ اقامت دین کا ہدف جب بھی حاصل ہوگا، دعوت دین اور پُرامن طریقے سے راے عامہ کی تربیت کا نتیجہ ہوگا۔

'تعبیر کی غلطی' کے اعتراضات

مولانا وحید الدین خان صاحب نے اس تصور اقامت دین پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان کا خلاصہ درج ہے:[۷]

۱- سورۂ شوریٰ کی آیت میں دین کا مطلب، دین کا وہ حصہ ہے جو تمام انبیاؑ کی دعوت میں مشترک ہے۔ اور یہ حصہ صرف توحید، رسالت اور آخرت، یعنی اسلام کے بنیادی عقائد تک محدود ہے۔ اسی کے قیام کا، یعنی اس کی پیروی اور اس کی دعوت کا یہاں حکم دیا گیا ہے۔[۸]

۲- سورۂ صف کی آیت میں (اسی مضمون کی آیت سورۂ توبہ میں اور اس سے مماثل آیت سورۂ فتح میں بھی آئی ہے) کوئی حکم یا ہدایت نہیں ہے بلکہ صرف خبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے دین کو اپنے نبی کے ذریعے غالب کرے گا، یہ اللہ کے ارادے کا اظہار ہے۔ اس میں مومنین کے لیے کوئی حکم نہیں ہے۔[۹]

۳- دین کا مقصد، بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنا ہے۔ یہی ایک مسلمان کا نصب العین ہے۔ ایک مسلمان کو دین پر عمل کرنا چاہیے اور دین کی دعوت پیش کرنی چاہیے۔ حکومت کی تبدیلی کے لیے جدوجہد اس کا کام نہیں ہے۔

مولانا وحید الدین خان صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ دین کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے لیکن ان کا اصرار یہ ہے کہ سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں، جس میں دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، دین کا مطلب صرف ایمانیات ہے اور یہی معنی مفسرین نے لیے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ جن مفسرین نے ایمانیات اور بنیادی باتوں کا ذکر کیا ہے، انھوں نے اس کے ساتھ طاعۃ اللہ فی اوامرہ و نواھیہ کو بھی دین کے مطلب میں شامل کیا ہے۔ اس میں دین کے تمام احکام آجاتے ہیں۔ مفسرین کے تفصیلی حوالوں کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔ مولانا رضی الاسلام ندوی نے اقامت دین اور نفاذِ شریعت میں قتادہ، علامہ ابن العربی، زمخشری، قرطبی، خازن البغدادی، العمادی، آلوسی، بیضاوی، ابن کثیر، رازی وغیرہم کے اقتباسات نقل کیے ہیں،[۱۰] جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ مفسرین یہاں دین کے معنی کو صرف عقائد و ایمانیات تک محدود رکھتے ہیں۔ اس آیت میں الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ (الرعد ۱۳:۳۰)

کا فقرہ بھی شامل ہے جس میں خود بخود وہ سارے احکام آجاتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انبیاے کرامؑ کی تعلیمات صرف عقائد اور ایمانیات ہی کے معاملے میں مشترک نہیں ہیں بلکہ ان کی دعوت کی روح بھی ایک ہی ہے۔ ان کی شریعتوں کی بنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں۔ اگر شرائع میں کچھ اختلاف ہے تو وہ جزوی اور فروعی باتوں میں ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس کی وضاحت مولانا صدر الدین اصلاحی [۱۳ نومبر ۱۹۱۶ء-۱۹۹۸ء] نے اس طرح کی ہے:

> ان حضرات (یعنی مفسرین کرام) کے نزدیک دین کی اصولی تعلیمات اور تمام انبیاؑ کے لائے ہوئے دینوں کی مشترک و متفق علیہ ہدایات الٰہی میں ایک اصولی تعلیم اور متفق علیہ ہدایت یہ بھی تھی کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے سارے اوامر کی بجا آوری کرنی ہوگی اور اس کے تمام نواہی سے رکنا پڑے گا۔ اس جامع اصولی ہدایت کا عملی مفہوم کیا ہوگا اور اس کی عملی تعمیل کس شکل میں ہو سکے گی؟ یہ کوئی ایسا سوال نہیں جس کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکیں۔ یہ جواب لازماً ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ امت ان سارے احکام دین و شریعت کی مکمل پیروی کرے گی، جو اسے اس کے پیغمبر کے ذریعے دیے گئے ہوں۔ یعنی مسلمانوں کے لیے اس پوری شریعت کی پیروی اور اقامت اس آیت کی رُو سے واجب ہوگی، جو حضرت محمدؐ کے ذریعے انھیں عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں دوسرے انبیاؑ کے دینوں کا ذکر اسم موصول عام کے ذریعے کیا گیا ہے لیکن آں حضرت کے دین کا ذکر اسم موصول خاص (الذی) کے ذریعے کیا گیا ہے۔[۱۱]

یہی بات اس آیت سے سمجھ میں آتی ہے اور یہی عام طور پر اس کی تفسیر بھی کی گئی ہے۔ یہاں دین کو اور قیامِ دین کے حکم کو صرف عقائد و ایمانیات تک محدود کر دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

یہ کہنا کہ: ''مومن کا نصب العین رضاے الٰہی ہے اور قیامِ دین کی جدوجہد، دین کا تقاضا تو ہو سکتا ہے نصب العین نہیں ہو سکتا''، محض الفاظ اور طرزِ بیان کا فرق ہے۔ جماعت کے نصب العین کی جو عبارت ہم نے نقل کی ہے، اس میں رضاے الٰہی اور فلاحِ آخرت کے حصول کو 'حقیقی محرک' کہا گیا ہے اور اس غرض کے لیے اجتماعی طور پر جس ہدف کی خاطر جدوجہد مطلوب ہے، اُسے نصب العین

کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل محرک اور حتمی ہدف تو رضاے الٰہی ہی ہے۔ لیکن اللہ کی رضا کا حصول ایک خاص قسم کی جدوجہد پر منحصر ہے۔ اس جدوجہد کا نشانہ اور ہدف اقامت دین ہی ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی صرف دستور جماعت تک محدود نہیں ہے۔ مولانا مودودی اور جماعت کے پورے لٹریچر میں اس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ اب اگر آپ رضاے الٰہی کے حصول کو نصب العین قرار دیں اور اقامت دین کو اس کی ضرورت یا تقاضا کہیں تو الفاظ کی اس تبدیلی سے کوئی عملی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اقامت دین اس صورت میں بھی ایک فریضے کے طور پر باقی رہتا ہے۔

مدیر 'اشراق' کے اعتراضات

جناب جاوید احمد غامدی مدیر اشراق (لاہور) نے اس تصور پر تفصیلی تنقید اپنے مضمون 'تاویل کی غلطی' میں کی ہے، جو ان کی کتاب بُرہان میں شامل ہے۔[۱۲] اس کے علاوہ انھوں نے اپنی کئی ویڈیوز پر مبنی تقاریر میں بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے، اور اپنے دیگر مضامین اور تفسیر میں بھی اس سے متعلق اشارے فرمائے ہیں۔ ان کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے:

۱- اقامت کا مطلب قائم کرنا یا نافذ کرنا نہیں ہے، بلکہ پیروی کرنا اور قائم رکھنا ہے۔ اس لیے سورۂ شوریٰ کی آیت میں صرف دین کی پیروی کا حکم ہے۔

۲- غلبۂ دین کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ اللہ کی سنت ہے کہ جب رسول مبعوث ہوتا ہے تو دین غالب ہو کر رہتا ہے۔ یہ سنت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پوری ہوگئی۔ اب عام مسلمان ان آیات کے مخاطب نہیں ہیں۔

۳- دین کے سیاسی اور اجتماعی احکام کے مخاطب حکمران ہیں اور وہی اس کے مکلف ہیں۔ عام مسلمانوں کا کام صرف اپنے دائرے میں دین پر عمل اور اس کی دعوت ہے۔

جاوید صاحب نے کلاسیکی عربی شاعری وغیرہ کے حوالوں سے تفصیلی بحث یہ ثابت کرنے کے لیے کی ہے کہ: ''اقیموا کے معنی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ قائم رکھنا ہے''۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اقامت کا ترجمہ 'قائم کرنا' کیا جائے یا 'قائم رہنا' یا 'قائم رکھنا'، اس سے اصل موضوع بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مولانا مودودی نے ترجمہ 'قائم کرنا' کیا ہے لیکن تفہیم القرآن میں 'قائم رکھنا' اِس ترجمے کی گنجایش کو بھی تسلیم کیا ہے۔ دین قائم کرنا یا دین پر قائم رہنا، دونوں کا مطلب یہی ہے کہ

زندگی کے تمام شعبوں میں دین کی پیروی کی جائے۔ اس بات کو جاوید صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں اور انھوں نے دین پر قائم رہنے کے معنوں میں قانون و شریعت اور جہاد و قتال وغیرہ سارے احکام شمار کیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ان کا کہنا یہ ہے کہ: ''**اقیموا** کا مطلب صرف دین کے اُس حصے پر عمل تک محدود ہے، جس کا تعلق ہماری ذات سے ہے، اور جن امور کا تعلق ہم سے نہیں ہے ان پر عمل کرانا یا انھیں نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا **اقیموا** کے معنی میں شامل نہیں ہے''۔ یہ نقطۂ نظر مفسرین کے بیان کیے ہوئے مطالب سے مختلف ہے۔

مولانا گوہر رحمٰن[۱۳] اور مولانا رضی الاسلام ندوی[۱۴] نے اپنی تحریروں میں اُن مفسرین کرام کے تفصیلی حوالوں سے بحث کی ہے، جن کے نزدیک **اقیموا** کے معنوں میں دوسروں پر دین کا نفاذ بھی شامل ہے۔ یہاں اگر جاوید صاحب کی یہ بات مان بھی لی جائے کہ: **اقیموا** کے لغوی معنی صرف خود دین پر عمل کرنا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود دین کا کیا مطلب ہے؟ کیا دین کے دائرے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دعوت، جہاد، اللہ کے دین کی نصرت، شہادت علی الناس وغیرہ جیسے اُمور نہیں آتے، جن کی قرآن میں تسلسل سے تاکید کی گئی ہے؟ جب یہ سب احکامِ دین ہیں اور دین کا جز ہیں (اور جاوید صاحب بھی اسے تسلیم کرتے ہیں) تو **اقیموا** کے دونوں معنوں میں جو معنی بھی لیے جائیں 'اقامت دین' کے اندر، یہ سب کام خود بخود شامل ہوجاتے ہیں۔ یعنی اگر **اقیموا** کا مطلب صرف یہ ہے کہ دین کے جو مطالبات میری ذات سے متعلق ہیں، ان کی تکمیل کی جائے تب بھی دعوت، جہاد، نصرت دین وغیرہ کے احکام میری ذات سے متعلق ہی ہیں۔ ان کی تعمیل تو اقامت دین کا تقاضا ہی ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ اقامت دین کا حکم کسی ایک آیت تک محدود نہیں ہے۔ قرآن کی پوری اسکیم میں اسے مرکزی ذمہ داری کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن نے اس کام کو کئی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ 'اظہارِ دین'، 'قیامِ قسط'، 'قیامِ عدل'، 'شہادت علی الناس'، 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر'، 'دعوتِ دین'—— ان سب میں اقامتِ دین کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ ان سب احکام کا تقاضا یہی ہے کہ دین پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ باقی انسانیت کو دین کی طرف بلانے، دین پر انھیں مطمئن کرنے اور معاشرے میں اللہ کے احکام کی ترویج وتنفیذ کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ مولانا مودودی

اور اسلامی تحریکیں انھی باتوں کو 'اقامت دین' قرار دیتی ہیں۔

جاوید صاحب قرآن کے بہت سے احکام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے جو احکامات دیے ہیں، وہ تمام مسلمانوں کے لیے ہیں اِلّا یہ کہ نبی کریمؐ کے لیے ان کی تخصیص کی کوئی واضح دلیل ہو۔ اظہارِ دین والی آیات کے سلسلے میں بھی موصوف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں اللہ کے وعدے اور سنت کا ذکر ہے۔ وہ یہاں **المشرکون** کا ترجمہ 'عرب کے مشرک' اور **دین کلہ** کا ترجمہ 'عرب کے ادیان' کرتے ہیں۔ اس تخصیص کی بھی کوئی دلیل اس کے سوا نہیں دیتے کہ غلبۂ دین، رسولؐ کے سلسلے میں انبیاؑ کی سنت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دین کا غلبہ مکمل فرمایا۔ سورۂ صف کی اس آیت میں لِیُظھِرہ کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ یہاں اظہار دین کو نبی کے مشن اور مقصد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اللہ کے ارادے کا ہی اظہار نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن اور مقصد بعثت کا بھی اظہار ہے۔ صرف غلبۂ دین کے الٰہی ارادے کا اظہار مقصود ہوتا تو نبی کی بعثت کے ذکر اور اس کے بعد، اظہارِ دین کے ذکر کے ساتھ لامِ تعلیل (لِیُظھِرہ) کی ضرورت نہیں تھی۔ بے شک غلبۂ دین اللہ ہی کا منصوبہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے اس منصوبے کو نبی کے ذریعے مکمل کرنا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے نبی کو مبعوث کیا۔ اسی وجہ سے اسے نبی کا مشن کہا جاتا ہے۔ اگر یہ نبی کا مشن اور اُن کا کام تھا تو نبی کے بعد آپؐ کی اُمّت کا کام کیوں نہیں ہوگا؟

جاوید صاحب، غلبۂ دین کی سنت الٰہی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ اس سنت کی تکمیل اپنے تکوینی امر کے ذریعے کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں فرقہ جبریہ نے خدا کے تکوینی اور تشریعی احکام میں بڑا مغالطہ کیا تھا۔ زیر بحث فکر میں یہی مغالطہ غلبۂ دین کی سنت کے معاملے میں محسوس ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان آیات میں اِرسال رسول کا ذکر واضح طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ اظہار دین کی سنت الٰہی، نبی کی جدوجہد کے ذریعے پوری ہوگی۔ نبی اللہ کی رہنمائی میں لیکن اپنے آزاد ارادے کے ساتھ اظہارِ دین کی جدوجہد کرتا ہے،

فیصلے کرتا ہے، حکمتِ عملی بناتا ہے، جہاد کرتا ہے، معاہدے کرتا ہے، جہاں ضرورت ہو لڑتا ہے اور جہاں ضرورت ہو صلح کرتا ہے۔ دعوت، ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گزرتا ہے۔ سیاسی حکمتِ عملی بناتا ہے اور اپنی تدبیروں سے، خدا کی مشیت کے تحت اس کی سنت کی تکمیل کرتا ہے۔

اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو تمام مسلمانوں کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ آپؐ کا کام اب اس امت کو جاری رکھنا ہے۔ غلبۂ دین کے مشن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کر دینے اور امت کو اس سے مستثنیٰ کر دینے کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے خصوصاً اس لیے کہ دیگر اور نصوص ایسے موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا غلبہ بعد کے زمانوں میں بھی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

> وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمرٰن ۳:۱۳۹)، دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔
>
> وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ، (النور ۲۴:۵۵) تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اُن کو وہ اِس سرزمین میں ضرور اُسی طرح اقتدار عطا فرمائے گا، جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو اُس نے عطا فرمایا تھا اور اُن کے لیے اُن کے دین کو پوری طرح قائم کر دے گا۔

حدیث میں ہے: اَلْاِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ[15]، یعنی اسلام دنیا میں غالب ہونے کے لیے آیا ہے، سرنگوں ہونے کے لیے نہیں۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں کتاب الامارۃ کے تحت ایک پورا باب باندھا ہے، جس کا عنوان ہے: لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ[16] میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور اپنے مخالفوں پر غالب آئے گا۔ اسی طرح کا ایک باب امام بخاری نے بخاری میں کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ میں باندھا ہے۔ ان ابواب میں کئی حدیثیں بیان کی گئی ہیں، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اہل حق کا

ایک گروہ اسلام کے لیے جدوجہد کرتا رہے گا اور اسے غلبہ ملے گا۔ مثلاً مسلم میں حضرت معاویہؓ سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے:

مَنْ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْراً یُفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَلَا تَزَالُ عِصَابَۃٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ ظَاھِرِیْنَ عَلٰی مَنْ نَاوَأَھُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ ،[۱۷] جس شخص کی اللہ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ دیتا ہے اور ہمیشہ ایک جماعت مسلمانوں کی حق پر لڑتی رہے گی اور غالب آئے گی ان پر جو ان سے لڑیں قیامت تک۔

عقلی دلائل

اس مختصر مقالے میں تفصیلی شرعی دلائل کی گنجایش نہیں ہے۔ ضروری باتیں عرض کردی گئی ہیں۔ جو لوگ اور تفصیل سے مطالعہ کرنا چاہیں وہ اس موضوع پر لکھی گئی بعض اہم کتابوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب تک جن کتابوں کے حوالے آچکے ہیں ان کے علاوہ، خصوصاً مولانا احمد عروج قادری کی کتاب اقامت دین فرض ہے اور اُمت مسلمہ کا نصب العین نیز مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب فریضہ اقامتِ دین اور مولانا سیّد جلال الدین عمری کی کتاب معروف و منکر وغیرہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اس موقعے پر اس موضوع کو عقل عام (Common Sense) کے پہلو سے بھی زیر بحث لاتے ہیں:

۱- دونوں معترض حضرات یہ بات مانتے ہیں کہ اسلام نے اجتماعی امور سے متعلق تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ اور ان ہدایات کی تعمیل آج کے دور میں بھی ضروری ہے اور یہی انسان کی فلاح اور کامیابی کا خدائی نسخہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ نے اپنے بندوں کے لیے ایک اجتماعی نظام کو پسند کیا ہے، تو پھر آج بندوں کے درمیان اس کو متعارف کرانے، اور اسے جاری کرنے کا کیا انتظام ہے؟ ایک زمانے میں نفاذ کا یہ کام اللہ نے اپنے رسولؐ سے لیا تھا۔ اب اگر آج عام مسلمان اس کے نفاذ کی جدوجہد کے مکلف نہیں ہیں تو پھر یہ کام کس کے ذمہ ہے؟

یہ بات تو عقل عام کے خلاف ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لیے ایک مکمل نظام زندگی نازل کیا، بڑی وضاحت کے ساتھ اس کی تفصیلات بتائیں، انھیں محفوظ رکھنے کا بھی انتظام کیا۔

ایک زمانے میں اپنے رسولؐ کے ذریعے اس کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی تنفیذ کا بھی انتظام کیا، لیکن بعد کے اَدوار میں انھیں انسانوں کے درمیان مقبول کرنے اور ان کے معاشروں میں جاری و ساری کرنے کا کوئی انتظام ہی نہیں کیا۔ یہ بات تو کم از کم آج کے دور میں کوئی معقول آدمی نہیں کہہ سکتا کہ کوئی اجتماعی نظام زندگی صرف اس کے تعارف اور پیش کش کے ذریعے خود بخود نافذ ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی اس انتہائی سادہ لوح مفروضے پر یقین رکھتا ہے، تو آج کا سارا علمِ سیاسیات اور علمِ سماجیات اس کی تردید و تغلیط کے لیے موجود ہے۔ ہر نظریہ اور نظام اپنے نفاذ کے لیے انسانی جدوجہد چاہتا ہے، اور ایسی جدوجہد چاہتا ہے جو اجتماعی ہو اور مطلوب نظام زندگی کو ہدف بنا کر کی جائے۔ اگر صرف نظریہ اور اصولوں کی موجودگی کافی ہوتی تو قرآن کا نزول کافی تھا، رسولؐ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

انفرادی زندگی سے متعلق اسلامی احکام بھی انسانوں کی فلاح کے لیے ہیں اور یہی معاملہ اجتماعی زندگی سے متعلق احکام کا بھی ہے۔ جس طرح شرک اور جھوٹ ایک فرد کے لیے نقصان دہ ہے، اسی طرح سود اور قوم پرستی اور انسانوں کی غیر مشروط خودمختاری، یہ انسانی معاشروں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر اپنے بندوں کی فوز و فلاح مقصود ہے، اور صرف افراد کی نہیں بلکہ معاشروں کی اجتماعی فلاح بھی مقصود ہے، تو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے نازل کردہ ان اصولوں کی تنفیذ کا کوئی انتظام ہی نہ کرے، جو انسانوں کے لیے نہایت ضروری ہیں (ہم یہاں اس بحث کو نہیں چھیڑ رہے ہیں کہ افراد کی اصلاح کا بھی ایک بڑا پہلو سماجی اور معاشرتی اصلاح سے ہے)۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی ترویج و تنفیذ کا کام انسانوں ہی سے لیتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں اللہ نے اپنے بندوں سے دین کی نصرت اور اللہ کا مددگار بننے کا حکم دیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (محمد ۴۷:۷)
اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جمادے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ (الصف ۶۱: ۱۴)، اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ دین کے معاملے میں منشاے الٰہی کی تکمیل

کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اگر منشاے الٰہی یہ ہے کہ یہ دین زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی معاملے میں انسانوں کا رہنما بنے، تو اس منشا کی تکمیل کے لیے جدوجہد ہی دین کی نصرت قرار پائے گی۔ اسی جدوجہد کو اسلامی تحریکیں 'اقامتِ دین' کی جدوجہد کہتی ہیں۔

انسانی معاشروں میں ہمیشہ ایسی قوتیں کارفرما رہی ہیں، جو انسانی زندگی کی تنظیم گمراہ کُن شیطانی اصولوں اور نظریات کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ کیا یہ بات اللہ کی مشیت اور اس کی اسکیم کا حصہ ہوسکتی ہے کہ معاشرے میں قوم پرستانہ فسطائیت اور کمیونزم کی منظم تحریک جاری وساری ہو، انتہاپسندانہ سرمایہ داری کے قیام ونفاذ کی منظم جدوجہد ہوتی رہے، نسائیت پرست اور ہم جنس پرست منظم ہوکر اپنے اپنے سیاسی ومعاشی تصورات کے نفاذ کے لیے سرگرم رہیں، لیکن اللہ کا مکمل دین اور انسانی فوز وفلاح کا حقیقی ضامن نظریۂ حیات صرف کتابوں میں بند رہے، یا ایسے حکمران کے انتظار میں راہ تکتا رہے، جو ان احکام کی تنفیذ کو اپنی ذمہ داری سمجھے؟ یہ بات بالکل عقلِ عام کے خلاف ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے کسی مخصوص نظریۂ حیات کو پسند کرتا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی تنفیذ کے لیے جدوجہد کی ذمہ داری کسی نہ کسی کے سپرد کرے۔ یہ فطری بات ہے کہ یہ ذمہ داری انھی کے سپرد کی جائے گی، جو اس نظریے کے ماننے والے اور اس کے امین ہیں۔

۲- اگر اجتماعی امور میں احکامِ دین کے نفاذ کی ذمہ داری صرف حکمرانوں کی ہے، تب بھی کیا عام مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پابند نہیں ہیں؟ اگر حکمران اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کررہے ہیں اور اللہ کے احکام سے علانیہ انحراف کررہے ہیں، تو کیا یہ مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کی طرف اپنے حکمرانوں کو متوجہ کریں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ لِلّٰهِ وَ لِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَ عَامَّتِهِمْ [18] ''دین خیرخواہی کا نام ہے۔ خیرخواہی اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، مسلمانوں کے اماموں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے''۔

ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ مروان نے عید کے دن منبر نکلوایا اور نماز عید سے پہلے خطبہ شروع کردیا، تو ایک شخص نے کہا: مروان! آپ نے سنت کے خلاف کیا۔ ایک تو آپ نے اس دن

منبر نکالا حالاں کہ اس دن منبر نہیں نکالا جاتا۔ پھر آپ نے نماز سے پہلے خطبہ شروع کیا، حالاں کہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں ہوتا۔ ابوسعید خدریؓ نے کہا: اس شخص نے تو اپنا وہ حق جو اس پر تھا ادا کر دیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ''تم میں سے جو شخص کوئی بات خلافِ شرع دیکھے، تو اگر اسے ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو تو اسے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اس کو دل سے بُرا جانے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔[19]

ایک حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا: سَتَکُوْنُ اُمَرَاءُ فَتَعْرِفُوْنَ وَ تُنْکِرُوْنَ فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ وَمَنْ اَنْکَرَ سَلِمَ وَلٰکِنْ مَنْ رَضِیَ وَ تَابَعَ قَالُوْا اَفَلَا نُقَاتِلُھُمْ قَالَ لَا، مَا صَلَّوْا[20] ''یعنی عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جنھیں تم پہچانتے ہوگے اور ان کا انکار کرو گے، پس جس کسی نے ان (کی حقیقت) پہچان لی وہ بری ہوگا، جس کسی نے برملا ان کا انکار کیا وہ تو سلامتی کے راستے پر ہوگا سوائے اس کے جو ان پر راضی ہوگیا اور ان کی اطاعت کرنے لگا (یعنی نہ وہ بری ہے اور نہ سلامتی کے راستے پر)''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا ایسے امرا کے خلاف ہمیں قتال نہیں کرلینا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا: جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں ایسا مت کرنا۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں جہاں اس حدیث کا باب باندھا ہے، اس باب کا موضوع ہی رکھا ہے: باب وجوب الانکار علی الامراء فیما یخالف الشرع وترک قتالھم ما صلوونحو ذٰلک (یعنی اس بات کا باب کہ اگر امرا شریعت کی خلاف ورزی کریں تو ان کی نکیر واجب ہے......)۔ گویا جو حکمران اللہ کے احکام کی کھلی نافرمانی کریں، ان کے خلاف خروج اور قتال کے لیے تو کچھ اور شرائط ہیں، لیکن ان کی نکیر اور ان کو معروف کی تلقین اور اسلام کے نفاذ کے لیے ان کو آمادہ کرنا، یہ کام تو ہر حال میں اہل ایمان کو انجام دینا ہے۔

۳- آج کے زمانے میں ملکوں کے نظام اور قوانین کے لیے صرف حکمران ذمہ دار نہیں ہوتے، عوام بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ دنیا کے بیش تر ملکوں میں تو جمہوری نظام ہیں۔ جمہوری نظام کی تو تعریف ہی یہی ہے کہ وہاں قانونی طور پر عوام ہی اصل حکمران ہوتے ہیں۔ حکومت کے کام انھی کے منتخب نمایندے انجام دیتے ہیں۔ ملک کی قانون سازی اور پالیسی سازی عوامی رجحانات کے

مطابق ہی ہوتی ہے۔ اس لیے اب تو یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے کہ حکمرانی سے متعلق احکامِ دین کے مخاطب صرف حکمران ہیں، عوام نہیں ہیں۔ اب یہ بات ساری دنیا میں مسلمہ ہے کہ جمہوری حکومتوں میں جو پالیسیاں بھی بنتی ہیں، ان کے لیے عوام پوری طرح ذمہ دار ہیں۔ عوام کے سامنے جواب دہ اور عوام کے ووٹ سے منتخب حکومت، اگر اللہ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی کرتی ہے اور وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی تصویر بنی رہتی ہے، تو اس معاشرے میں رہنے والے مسلمان کیسے اس کی ذمہ داری سے بری ہو سکتے ہیں؟ براءت کی ایک ہی شکل ممکن ہے اور وہ یہ کہ وہ معاشرے کو اسلام کے نفاذ کے لیے تیار کرنے کی بساط بھر کوشش کرتے رہیں۔ بلاشبہہ وہ کسی ایسے کام کے مکلف نہیں ہیں جو اُن کی طاقت اور استعداد سے باہر ہو لیکن جو کچھ ان کے بس میں ہے، اُس جدوجہد کی ذمہ داری سے وہ کیسے بری ہو سکتے ہیں؟ اسلام میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ ہم کو ایسے واضح نصوص بھی ملتے ہیں جن میں معاشرے کی اجتماعی خرابیوں کے لیے معاشرے کے ہر فرد کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے:

> وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ○ (الانفال ۸: ۲۵)، اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

جاوید صاحب خود اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> دنیا میں خدا کا قانون یہی ہے کہ بعض اوقات ایک گروہ کے جرائم کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔ یہ اُس سے متنبہ فرمایا ہے کہ اپنے رویے کی اصلاح کر لو، ورنہ اندیشہ ہے کہ اُس طرح کے کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے جو پوری جماعت، بلکہ آیندہ نسلوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ اللہ کے دین میں اِسی بنا پر لوگوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بھلائی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔[21]

حدیث میں آیا ہے:

> مَا مِنْ قَوْمٍ يعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِى فَلَمْ يُغَيِّرُوا إِلا أَوْشَكَ أَن يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ

بِعِقَابٍ [۲۲] اگر کسی قوم میں گناہ کے کام کیے جاتے ہوں اور ان کاموں کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں گرفتار کرلے۔

۴- کسی نظریے پر پختہ ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد کی جائے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے اجتماعی احکام پر عمل ضروری نہیں ہے (اس مکتب فکر کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا تھا) تو اس کا معاملہ مختلف ہے۔ لیکن اگر کسی کا یہ ایمان ہے کہ اسلام سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے، اور یہ رہنمائی ہی انسانوں کی فوز و فلاح کی واحد ضامن ہے، تو اس کے بعد، اس نظریے کے نفاذ کا خواب دیکھنا اور اس کے لیے ممکنہ جدوجہد کرنا خود بخود اس کی ذمہ داری بن جاتا ہے۔

زندگی کے مشن اور نصب العین کا گہرا تعلق اعتقاد (Belief) سے ہوتا ہے۔ ہر مشن اور نصب العین کسی اعتقاد کی پیداوار ہوتا ہے اور ہر پختہ عقیدہ کسی نہ کسی نصب العین کو لازماً جنم دیتا ہے۔ اعتقاد اور زندگی کے مشن (Life Mission) کے درمیان یہ گہرا تعلق آج علم انتظامیات، سماجی نفسیات، سماجیات وغیرہ علوم کا مسلمہ اصول ہے۔ ان سب علوم میں یہ بحثیں موجود ہیں کہ آدمی اپنے بارے میں اور دیگر انسانوں اور کائنات کے بارے میں جو نقطۂ نظر یا اعتقاد رکھتا ہے اور جن قدروں (Values) اور اصولوں کو اپنے لیے اور دیگر انسانوں کے لیے درست اور صحیح سمجھتا ہے، اسی نظامِ اقدار سے اس کی زندگی کا مشن تشکیل پاتا ہے۔ کسی بھی میدان میں تبدیلی کی ضرورت پر پختہ یقین آدمی کو اس تبدیلی کی تحریک چلانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے، اقامت دین کا نصب العین اس عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے کہ اسلام اللہ کا دین ہے اور اسی میں انسانوں کی نجات ہے۔ عقلی اعتبار سے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آدمی کا عقیدہ تو اسلام میں ہو، لیکن اسلام کا قیام اس کا نصب العین نہ بنے۔

اگر آج میں کینسر کی ایک نئی دوا ایجاد کرلوں اور میرے اندر یہ مستحکم یقین پیدا ہوجائے کہ اس دوا سے کینسر کا ہر مریض لازماً شفا پالے گا اور یہ کہ اس انمول دوا کی ترویج اس وقت عالم انسانیت کی ایک بڑی ضرورت ہے، تو اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس دوا کی ترویج، اور ملک کے نظامِ صحت میں اس کی قبولیت میرا نصب العین بن جائے گا۔ اگر اس دوا کے کارگر ہونے پر کامل یقین کے باوجود میں اسے لے کر گھر میں بیٹھا رہوں، تو میری یہ خاموشی انسانیت کے خلاف ہی تصور کی جائے گی

اور میرے ضمیر بلکہ میری انسانی فطرت کے خلاف ہوگی۔ مختلف ازم کے علَم بردار اپنے اپنے نظریات کے قیام و نفاذ کے لیے اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کی کتابوں کی عبارتوں کی لغات کے ذریعے تشریح کر کے بتایا جائے کہ اس کا قیام و نفاذ تمھاری ذمہ داری ہے۔ ان اصولوں کی صحت پر یقین اور اُن کے انسانوں کے لیے مفید اور موزوں ہونے پر یقین بذاتِ خود اس بات کے لیے کافی تصور کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے نفاذ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے دیں۔

یقیناً اسلام نے یہ اصول دیا ہے کہ نفاذ کا یہ کام زور زبردستی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ میں کینسر کی دوا بھی کسی مریض کو بندوق کی نوک پر نہیں پلاؤں گا۔ ڈاکٹروں کو بھی اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں دوسروں کا یہ حق بھی تسلیم کروں گا کہ اگر کوئی اس دوا کو مؤثر نہیں سمجھتا ہے یا نقصان دہ سمجھتا ہے تو وہ بھی اپنی بات لوگوں کے سامنے پیش کرے، لیکن میں آخری کوشش اس مقصد کے لیے ضرور کروں گا کہ لوگ اس کی افادیت کے قائل ہوجائیں، اس کے حق میں راے عامہ بن جائے اور اس کی تنفیذ ممکن ہوجائے۔ بالکل یہی کام مجھے اسلام کے سلسلے میں بھی کرنا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱- دستور جماعت اسلامی ہند، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی، مئی ۲۰۱۶، ص ۷

۲- ایضاً، ص ۸

۳- سیّدابوالاعلیٰ مودودی، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، دوم، لاہور، ص ۱۷۵-۱۷۶

۴- سیّدابوالاعلیٰ مودودی، تصریحات (مرتبہ: سلیم منصور خالد)، لاہور ص ۲۵۷-۲۵۸

۵- ایضاً، ص ۳۲۰ تا ۳۲۲

۶- سیّدابوالاعلیٰ مودودی، تفہیمات، سوم، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ستمبر ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۲-۱۶۳

۷- تعبیر کی غلطی، مولانا وحیدالدین خان، مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، تیسرا ایڈیشن، اکتوبر ۱۹۸۶

۸- سورۂ شوریٰ کی آیت ۴۲:۱۳ کی طرف اشارہ ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط (اُس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ!) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اِس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہوجاؤ۔ [ترجمہ مولانا مودودیؒ])

۹- سورۂ صف کی آیت۶۱:۹ کی طرف اشارہ ہے: ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْن (وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو [ترجمہ مولانا مودودیؒ])۔ یہی بات سورۂ توبہ کی آیت ۳۳ میں بھی کہی گئی ہے اور اس سے مشابہ مضمون سورۂ فتح کی آیت ۲۸ میں بھی آیا ہے: ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا (وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے)۔

۱۰- ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، اقامت دین اور نفاذ شریعت، نئی دہلی، مئی ۲۰۱۲ء، ص۱۰ تا ۱۸

۱۱- مولانا صدرالدین اصلاحی، 'خط مولانا صدرالدین، ماہنامہ تجلّی، دیوبند، فروری و مارچ ۱۹۶۵ء، ص۵۱

۱۲- جاوید احمد غامدی، تاویل کی غلطی، مجموعہ مقالات بُرہان، المورد، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۶۹ تا ۱۸۰

۱۳- مولانا گوہر رحمٰن، تفہیم المسائل، جلد پنجم، مکتبہ مدرسہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۰ء، ص۳۶۷ تا ۴۰۹

۱۴- ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، اقامت دین اور نفاذ شریعت، ص۲۷ تا ۳۱

۱۵- بیہقی، دارقطنی، البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

۱۶- مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث: ۳۶۳۶

۱۷- مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث: ۳۶۴۱

۱۸- صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدین النصیحہ، رواہ تمیم الداری، حدیث: ۱۰۷

۱۹- سنن ابن ماجہ، باب امر بالمعروف ونہی عن المنکر، رواہ ابوسعید الخدریؓ۔

۲۰- صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، روایت اُم سلمہؓ

۲۱- جاوید احمد غامدی، البیان، تفسیر سورۂ انفال آیت ۲۵

۲۲- ابن ماجہ ۱۳ / ۱۲، نمبر ۳۹۹۹، مسند احمد ۱۹۵ / ۳۹، البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

۲۳- سورۂ نور، آیت ۵۵، ترجمہ جاوید احمد غامدی

مرتب شدہ تصنیف کے حوالہ جات:

1. اسلام ایک نظریں ـــ از صدر الدین اصلاحی۔
ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔

2. دین حق ـــ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

3. اسلامی نظریہ ـــ از خورشید احمد۔

4. اسلام اور جاہلیت ـــ از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

5. فکرِ اسلامی ـــ از خرم مراد۔

6. اقامتِ دین فرض ہے ـــ از احمد عروج قادری۔

7. تصورِ اقامتِ دین پر اعتراضات اور جدیدیت مابعد جدیدیت ـــ
از سید سعادت اللہ حسینی۔

8. اسلامی تحریک: سفر و سمت ـــ از ڈاکٹر رفعت۔